

ایک چادر مکی سی

راجندر سنگھ بیدی

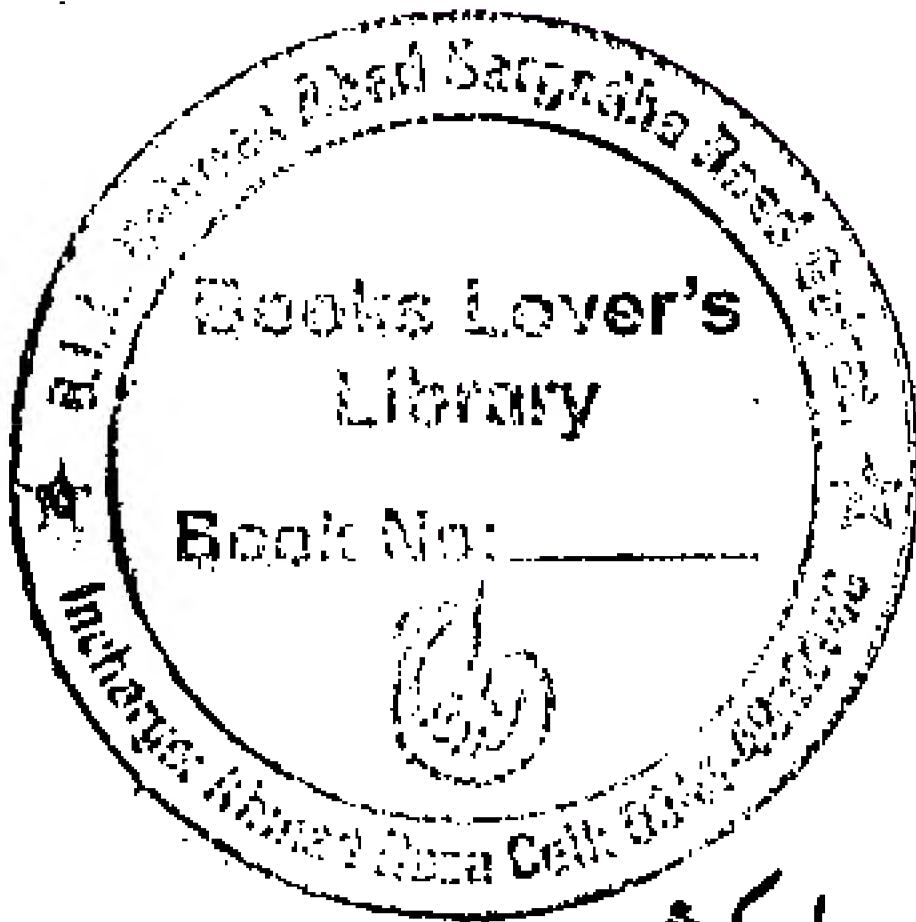


ایک چادر میلی سی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

راجندر سنگھ بیدی



سیونٹھ سکائی پبلی کیشنز

غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ 40۔ اردو بازار، لاہور

فون: 37223584، موبائل: 0300-4125230

جملہ حقوق محفوظ

ایک چادر میلی سی	نام کتاب
راجندر سنگھ بیدی	مصنف
سیونٹھ سکائی پبلی کیشنز، لاہور	ناشر
زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور	مطبع
جنوری 2014ء	سن اشاعت
200/= روپے	قیمت

..... ملنے کے پتے

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اردو بازار، لاہور

کتاب گھر

اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

ویکم بک پورٹ

اردو بازار، کراچی

رشید نیوز ایجنسی

اخبار مارکیٹ، اردو بازار، کراچی

شمع بک ایجنسی

بھوانہ بازار، فیصل آباد

اشرف بک ایجنسی

اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

خزینہ علم و ادب

الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

جہانگیر بکس

بوہڑ گیٹ، ملتان

کشمیر بک ڈپو

تلہ گنگ روڈ، چکوال

ادارہ کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ، طبعیت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرمادیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائیگا۔ (ناشر)

انتساب

اشک مجروحؔ امر اور سریندر کے نام

”اپنا لہو بھی سرخی شام و سحر میں ہے“

مجروحؔ

سے بڑا..... مگر تم نے کبھی سوچا ہے کہ یہ عورت ہی کے دور واپس ہیں.....؟“

میٹری نے اپنی ہڈی کی گردن گھمائی اور اپنی سوچ میں گم ہو گئی۔ پھر پیار کی کندیں پر بودھ پہ پھینکتی، اپنا دلیاں پر پر بودھ کے بائیں پر میں پھنساتی ہوئی بولی۔ ”مجھے جہا نجریں لا دوں۔ جو اتھنر کے کھنڈر میں ابھی تک لوگوں کی نظروں سے لوجھل پڑی ہیں..... پھر میں تمہیں وہ پیار دوں گی کہ.....“

پر بودھ نے جہا نجروں کے بارے میں سوچنے سے پہلے ہی گھوں گھوں کرتے، پھولتے ہوئے اپنی چونچ میٹری کی چونچ میں اس کے تالو تک کھسادی اور پھر خود ہی علاحدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”کیا فائدہ اس پیار کا جہل میں ہم مر بھی نہ سکیں۔ کسی وقت تو مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے جینا نہیں مرنا امر ہے۔“ اور پھر وہ کہہ اٹھا۔ ”سب الٹ پلٹ ہو گیا ہے.....“

میٹری بھی جانتی تھی کہ پر بودھ اس وقت جہا نجریں نہ لا کر دے گا۔ جب تک اس کی سوچ میں کوئی خود غرضیاں نہ ہوں گی۔

پھر پر بودھ چھتری صدیوں کی باتیں کرنے لگا اور ان راسوں کی جو دمیر یاں نے اسکندریہ میں ایفرودیتی کے ساتھ سمندر کے کنارے رہ چائی تھیں۔ پھر ایڈے پس کی جس نے نادانی میں اپنی ماں سے شادی کر لی تھی۔ اور جب اسے پتا چلا تو مدے ہی سے چل بسا..... ویرگنل کی باتیں جس کی محبوبہ اس کے باپ کے ساتھ ساٹھی ہو گئی تھی اور جس کے کارن گنل کو اپنی آنکھیں دینا پڑیں..... پھر بھرتی ہری کی جس نے حسن اور جوتی کو دائم قائم رکھنے والا سیب اپنی رہنی کو دے دیا۔ مگر رہنی نے اپنے عاشق ایک دھوبی کے حوالے کر دیا جس نے اُسے اپنی محبوب طوائف کو دے دیا۔ جو ساری دنیا کا بھلا کرنے کے لیے اسے وقت کے بادشاہ بھرتی ہری کے پاس لے آئی۔

پر بودھ اور میٹری نے قزل سے سب کچھ دیکھا تھا اور اب ابد دیکھنا چاہتے تھے۔ مرد اور عورت کے درمیان یہ لا قانونیت دیکھ کر میٹری بولی۔ ”آخر کوئی تو قانون ہونا ہی چاہیے۔“ حالانکہ وہ آپنی من ست کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جو نیچے پنجاب کے میدانوں میں ایک پرانے۔، پڑ پر رہتا تھا اور بے حد جوان اور لاجوردی گردن والا خوبصورت کوتر تھا..... اس لیے کہ وہ قانی آتا..... اور اس کے بارے میں سوچتے ہوئے میٹری کا پورا بدن مہک اٹھا۔ پیٹ نہ ایک کسمپٹ سی دور گئی۔ وہ من ست کی بات کچھ اس انداز سے کرنے لگی جیسے کوئی، نے ہی نہ تھی۔ مگر اس کا نام سنتے ہی پر بودھ پنوں کے بل کھڑا ہو گیا

اور اس کے پر پھڑ پھڑانے لگے۔ پر بودہ کے غصے سے سر لرزے کودیکھ کر معیتری ڈر بھی رہی تھی اور اندر کے کسی جذبے سے خوش بھی ہو رہی تھی۔ نظریں چراتی ہوئی وہ بولی۔ ”زندگی کی فلاح کے لیے ہم ہی قانون بناتے ہیں۔۔۔۔۔ کیا خود انھیں توڑ نہیں سکتے؟“

پر بودہ جو کچھ دیر پہلے کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔ ”قدرت کا قانون افزائش نسل ہے۔ چاہے وہ کیسے بھی ہو، کسی سے بھی ہو۔۔۔۔۔ جلدی سے کہہ اٹھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔“

ایک دن کسی لمبی پرواز کے بعد پر بودہ اور معیتری اپنے گھونسلے میں لوٹ آئے۔ من ست اڑتا ہوا امر ناتھ کی گھانگ پیچھے آیا تھا۔ اور پھر مایوس ہو کر واپس ہو لیا۔ معیتری کو اس بات کی خوشی تھی اور افسوس بھی تھا۔۔۔۔۔ خوشی اس لیے کہ اس کا پر بودہ اب بھی اسے آسمانوں سے ہمیشہ نازل ہونے والی بلاؤں سے بچا سکتا تھا اور پھر وہ خود بھی اب تک اتنی خوبصورت اور جوان تھی کہ میدانوں کا من ست فرسگوں اس کے پیچھے اڑ کر آسکتا تھا اور مایوس ہو کر واپس جاسکتا تھا۔ اور افسوس اس بات کا کہ پر بودہ اسے کسی وقت بھی ایک آزاد پرواز سے روکتا تھا۔

گھونسلے میں پہنچے ہی پر بودہ اور معیتری کو ایک عجیب سی نرمی اور گرمی، سکھ اور آرام کا احساس ہوا۔ جب پر بودہ نے اپنی مستی بھری آنکھوں سے معیتری کی طرف دیکھتے ہی اپنے پر اس پر پھیلا دیے اور کہنے لگا۔

”رانی! ہم نے کتنی دنیا دیکھی ہے۔۔۔۔۔ کتنے جنگ۔۔۔۔۔ کتنے دیش۔۔۔۔۔ پر اس دھرتی پر ایک ایسا دیش ہے جس کی کوئی مثال نہیں۔“

”پنجاب! معیتری اپنے میدانوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ اٹھی۔ اور پھر اس نے ایک سرد آواز بھری جسے پر بودہ نے نہ دیکھا۔

”تم نے کیسے بوجھ لیا؟“ پر بودہ نے ششدر ہو کر پوچھا۔ اور اس کی لمبی چانچ نے ایک سرخی پکڑ لی۔ معیتری کہنے لگی۔ ”وہی تو ایک دیش ہے جس کی دھرتی میں بے آنکھوں پہر لوہان کی خوشبو اٹھتی رہتی ہے، جس کا لمس بدن میں صحت کی خدش پیدا کرتا ہے۔۔۔۔۔“

”ہاں.....“ پر بودہ نے ہامی بھری۔ ”اس کے پر بت آسمانوں کے ہمسائے ہیں اور دھرتی کی ہری اوڑھنی پہ ویرانی کے رنگ کا ایک بھی چھینٹا تو نہیں۔ اس کے دریا تو ایک طرف، پوکر بھی انوراک سے واقف ہیں۔“

”جہاں کے مرد اکھڑ ہیں، عورتیں جھکوں۔ وہ خود ہی اپنے قانون بناتے ہیں اور اگلے ہی پل بے بس ہو کر خود ہی انھیں توڑ بھی دیتے ہیں اور پھر نئے قانون وضع کرنے کے لیے چل نکلتے ہیں۔ دیوی ماں سرزد ہونے سے پہلے ہی ان کے گناہوں کو معاف کر دیتی ہے۔ کیونکہ انھوں نے بہت دکھ دیکھا ہے۔ اثر پچھتم سے ان پر سیکڑوں حملے ہوئے۔ مگر انھوں نے اپنی فولاد سے زیادہ سخت چھاتیوں کو ڈھال بنایا۔ اور آلام کی سب ضر میں ان پہ لے لیں۔ انھوں نے اپنی ماؤں اور بہنوں کی عزت دے دی، پورے دلش کی ماؤں اور بہنوں کی عصمت بچانے کے لیے..... وہ کسی وقت بھی سونے کو مٹی میں رول دیتے ہیں اور پھر اسی مٹی کو کھجال کر اس میں سے کندن پیدا کر لیتے ہیں..... عجیب کیسا گر ہیں وہ.....“

”نہ معلوم وہ کس مٹی سے بنے ہیں۔ جتنی ہوئی برفوں اور تہتی ہوئی ریتوں میں وہ بس سکتے ہیں۔ جہاں دنیا کے لوگ دوسروں ہی کی نکتہ چینی میں لگے رہتے ہیں.....“

”وہاں پنجابی ہی ہے جو اپنے آپ پر بھی ہنس سکتا ہے۔ وہ اچھا دوست ہے اور بُرا دشمن..... جہاں بھی لوگ تھیں ایک بلند آواز سے ہنستے تہقہ لگاتے ہوئے سنائی دیں وہاں ضرور کوئی پنجابی ہوگا کیونکہ وہ دنیا کا ماتم نہیں کرنے آیا اور نہ فلسفہ دانی اس کا نصب العین ہے، وہ جو اندر سے ہے، وہی باہر سے..... اس کے جیون کار حسیہ ہی یہ ہے کہ کوئی رہنمائی نہیں.....“

”وہ ایک ایسا پودا ہے، رانی! جو دنیا کی کسی بھی دھرتی پہ پنپ سکتا ہے۔ اس کی اپنی دھرتی کی وسعت اس کی نگاہ اور دل میں سما گئی ہے اور ہواؤں کی مستی دماغ میں.....“

”رانی!..... پنجاب اور پنجابی کبھی ناش نہیں ہو سکتے۔ نہ معلوم انھوں نے کون سی امر کھاسی ہے جس میں وہ اونگھ بھی گئے نور پا بھی گئے، پی بھی گئے اور چھلکا بھی گئے۔ زندگی کے رونے دھونے سے ان کی سمیٹا پوری نہیں ہوتی۔ ہاں..... ہنسنے کھیلنے، کھانے اور پہننے ہی میں ان کا موکش ہے.....“

راجندر سنگھ بیرہ

ایک چار میل ی

(۱)

آج شام سورج کی نکیہ بہت ہی لال تھی..... آج آسمان کے کوٹلے میں کسی بے گناہ کا قتل ہو گیا تھا اور اس کے خون کے چھینٹے نیچے بکائن پر پڑتے ہوئے نیچے تلو کے کے صحن میں ٹپک رہے تھے۔ ٹوٹی پھوٹی کچی دیوار کے پاس جہاں گھر کے لوگ کوڑا پھینکتے تھے، ڈونمہ اٹھا اٹھا کر رو رہا تھا۔

دوپہر کے قریب بڑی ذیل کے کارندے جب سٹوں کو گولی ڈالنے کے لیے آئے، تو ڈبو بیٹھ گیا۔ وہ تلو کے کے ہاں کہیں صحن میں بڑی گھڑوچی کے نیچے سو رہا تھا۔ اوپر ملتان میٹھی کے گھرے رس رہے تھے اور نیچے کچی زمین کو ٹھنڈا اور خوش بودار بنا رہے تھے اور ڈبو اس ٹھنڈک اور بو باس سے پورا فائدہ اٹھا رہا تھا..... تھوڑی دیر میں وہ اٹھ کر اکڑا، منہ کھول کر جماعتی لی اور پھر باہر چلا آیا۔ جب تک اس کی چپتی کتیا بوڑی کی آنکھیں کالج ہو چکی تھیں۔ بوڑی کے پاس پہنچ کر ڈبو نے اسے ایک دو بار سونگھا اور پھر اچانک ایک سمت چل دیا جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ تلو کے کی بیوی رانو اور اس کی پڑوسن چتون ایک دوسری کامنہ تیکنے لگیں۔ چتون نے اپنی کو کے والی ٹاک پر انگلی دھری، پھر ایک لمبی سانس بھری اور بولی:

”ہا! مرد کی جات..... سب ایک ہی سی ہوتی ہے.....“

رانو کی غلافی آنکھیں پھڑ پھڑا رہی تھیں جیسے کوئی کپڑے کو دھو بنا کر چھانٹ رہا ہو پھر کچھ سننے لگی، مگر آنکھیں پونپختے ہوئے رانو نے چتون کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی:

”کیسے! تیرا ڈبو تو ایسا نہیں.....؟“

اس پر چتوں نے رانو کو ایک مردوں والی گالی دی جس سے وہ خود ہی شرما کر اپنے گھر کی طرف بھاگ گئی۔ رانو بھی اندر پہنچ کر کام کاج میں جا گئی۔ شام کے وقت جب وہ رات کی آہ اور دن کی واہ کا کوڑا پھینکنے کے لیے باہر آئی تو دوپہر کے سارے واقعات بھول چکی تھی جس ہاتھ سے اس نے کوڑا پھینکا، اسی سے جھاڑو چھانٹتے ہوئے وہ منہ اٹھا اٹھا کر رونے والے ڈبو کو بھگانے لگی۔

”ہات!..... ہات مُردے..... یہاں دھرا ہی کیا ہے، تیرے رونے کو؟..... رونائی ہے تو جاسا منے چودھریوں کے گھر جا کر رو، جہاں دولت کے ڈھیر ہیں، مردوں کی لام لگی ہے.....“

چودھری مہربان داس کے ساتھ رانی کو خدا واسطے کا بیر تھا۔ شاید اس لیے کہ تلو کے، رانی کے گھر والے، کو بد معاشی کی لت مہربان داس کے ہاتھوں لگی تھی، پھر گانو کی عورتوں کی عجیب بات..... اپنے مرد کا کچھ پتا نہیں، دوسروں کے مردوں کا کھایا پیا سب معلوم۔ رانو اپنے تلو کے کے بارے میں جب نواب لکے والے لیا گور داس کی بیوی سے سنتی تو جل بھن کر راکھ ہو جاتی۔ شاید راکھ نہیں، کوئلہ۔ کیونکہ اندر سے رانو بہت پکی تھی۔ تلو کا گھر لوٹا تو وہ اس سے لڑتی، اسے نو جتی کاٹتی اور پھر خود ہی مار کھاتی ہوئی ایک طرف جا بیٹھتی اور سو جتی۔ ”ایک طرح سے اچھا ہی ہے جو باہر ہی غصہ نکال آتا ہے اپنا..... میرے جی کا جنجال تو نہیں ہوتا.....“

ان، صرف ان باتوں سے رانو کو تلو کے کے مرد ہونے کا پتا چلا اور وہ ایک ضد کے ساتھ اسے اپنا بنانے کی کوششوں میں لگ جاتی۔ کوششیں کیا؟..... کنڈے پھیل کے نیچے ایک سائیں بابا تھا۔ جتی ستی! جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس نے لوہے کا لنگوٹ پہن رکھا ہے اور اب تک نہیں جانتا، عورت کیا چیز ہے؟ حالانکہ چوبیس گھنٹے، آنٹھوں پہر اس کے گرد عورتوں ہی کا جھگھڑا رہتا..... کوئی بیٹا مانگتی، کوئی اٹھرا کی دوائی..... اکثر

تو اپنے مردوں کو بس میں کرنے کے ٹوٹے ہی پوچھنے آئیں۔ ابھی کچھ ہی مہینے ہوئے اس نے پورن دئی مصرانی کو ٹوٹا دیا جس سے نہ صرف وہ پیٹ والی ہو گئی بلکہ گیان چند، اس کا مرد، پاگلوں کی طرح اس کے ارد گرد چکر کاٹنے لگا۔ رانو بھی ٹکو کے کی مار سے بچنے کے لیے باواہری داس سے ایک ٹوٹا لے آئی اور اس ٹاک میں لگ گئی کب ٹکو کا کچا دودھ مانگے اور وہ ٹوٹے کو اس میں گھول کر پلا دے اور پھر پاس نہ آنے دے۔ ہاں، جب منتیں کرے، پانو پڑے ٹاک رگڑے۔۔۔۔۔ تب۔۔۔۔۔ لیکن ہفتوں ٹکو کے نے کچا دودھ مانگا نہ پایا۔

ٹکو کا روز نہیں تو دوسرے تیسرے روز ضرور مٹھے مالٹے کی ایک بوتل چوہدری مہربان داس کے ہاں سے لے آتا تھا۔ رانو دنیا بھر کے عیبوں کو معاف کر سکتی تھی لیکن شراب کو نہیں۔ وہ سمجھتی تھی۔۔۔۔۔ شراب ایسی سوت نہیں دنیا میں۔ مزد چاہے اپنا سب کچھ کسی دوسری پر لٹا آئے پھر بھی اس کا کچھ نہ کچھ تو اپنے لیے بچ ہی رہتا ہے لیکن شراب؟ ماں ری ماں! اس سے تو اتنی بو آتی ہے کہ انسان منہ بھی قریب نہیں کر سکتا۔ یوں معلوم ہونے لگتا ہے جیسے اپنا تو کچھ بھی نہیں رہا۔ سب ہی کچھ لٹ گیا۔۔۔۔۔ ٹکو کا دن بھر نواب، اسماعیل، گورداس وغیرہ کے ساتھ اکٹھا نکلتا لیکن شام کے وقت، نصیبوں والے اڈے پر پہنچ کر اس ٹاک میں کھڑا ہو جاتا کہ کوئی بھولی بھکی، سواری مل جائے اور وہ اسے اچھے کھانے، نرم اور گرم بستر کے لالچ میں لے جا کر، مہربان داس کی دھرم شالہ میں چھوڑ دے۔ دراصل ٹکو کا یہ سب مہربان داس اور اس کے بھائی گھنٹام ہی کے لیے کرتا تھا لیکن اس پر بھی بدنامی اس کی اپنی ہوتی تھی۔ اس کے حصے میں آتی بھی تھی تو ایک آدھ چانپ اور مٹھے مالٹے کی بوتل۔۔۔۔۔

کوٹلہ جاترا کی جگہ تھی۔ چوہدری کی خویلی کے بازو میں دیوی کا مندر تھا جو کبھی بھیروں کے چنگل سے بچتی بچاتی، اس گانو میں آٹکی تھی اور اس جگہ جہاں اب ایک مندر کھڑا تھا، گھڑی دو گھڑی بسرام کیا تھا اور پھر بھاگتی ہوئی جا کر سامنے سیال کوٹ محوس وغیرہ کی

پہاڑیوں میں گم ہو گئی تھی..... اب بھی کسی دھلی ہوئی صبح کو کوٹلے سے شمال مغرب کی طرف دیکھا جائے تو دور، افق پر کسی ڈاچی کا کوہان سا نظر آتا ہے..... وہی ویشتود یوی کا پہاڑ ہے۔

تکو کے نے آج جس جاترن کو مہربان داس چوہدری کی دھرم شالہ میں چھوڑا وہ مشکل سے بارہ تیرہ برس کی ہوگی۔ دیوی کے پاس تو اپنے آپ کو بچانے کے لیے ترشول تھا جس سے اس نے بھیروں کا سرکاٹ کے الگ کر دیا لیکن اس معصوم جاترن کے پاس صرف دو پیارے پیارے گلابی سے ہاتھ تھے جنہیں وہ بھیروں کے سامنے جوڑ سکتی تھی، ان سے مدافعت نہ کر سکتی تھی۔ پھر بدن..... جیسے تربوز کے گودے کا بنا ہوا جو مہربان کی چھری سے بچ نہ سکتا تھا۔ شاید اسی لیے اس دن کا سورج، غصے میں لال اپنے رتھ کے گھوڑوں کو ادھر چھانٹا، ادھر چاٹا، ادھر چھانٹا، ادھر چاٹا لگا تا ہوا سامنے خانقاہ والے کنویں کے پاس، فارم کی کپاس کے پیچھے کہیں گم ہو گیا تھا اور اوپر آسمان پر، دوج کے نازک سے چاند کو نچڑنے، پیلا ہونے کے لیے چھوڑ گیا.....

دھرم شالے کے پاس ٹھیکے والوں کے مکان کو نئی ٹیپ ہوئی تھی۔ سیاہیوں کے پرے، دیواروں کے چہرے پہ چھٹ چکے تھے۔ اینٹوں کا گیر واد تو دکھائی نہ دیتا تھا، البتہ ان کے بیچ کا چونا، اتنے اندھیرے کے باوجود، سامنے ہنستا، منہ چڑاتا ہوا نظر آرہا تھا۔ پُروا میں کوٹلے کے سارے پھر دانہ، جاسن اور بکائن سنسار ہے تھے اور جوہڑ کے کنارے، باواہری داس والے لنڈے پھیل کے گنے چنے پتے ایک بے ہنگم سی آواز پر تال دے رہے تھے..... جس راستے پر تکو کا جا رہا تھا وہ گانو کے ایک ہی بازار اور بازار میں ایک ہی آٹے والے کی دکان کے سامنے سے ہو کر جاتا تھا جہاں اتفاق کی بات، ایک ہی عورت..... جہلم ارا عین اپنی ترکاری دے کر، اس کے بدلے گیہوں لے رہی تھی۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے تکو کے نے آواز دی۔

”کیوں جہلمیں..... پھر کیا مرضی ہے؟“

گانو بھر میں ایسے آوازوں کی عادی، غریب کی جو روسب کی بھابی، جہلم نے تلو کے کی طرف مڑ کے بھی نہ دیکھا اور جھولی اناج سے بھرتی ہوئی بولی ”جو تیری ماں کی ہے، تلو کا! ہائے تجھے پیدا ہونے سے کسی نے نہ روکا؟“
..... اور تلو کا ہنستا ہوا نکل گیا۔

گھر پہنچا تو اس کے جڑواں بیٹے ابھی تک بکائن کے نیچے، کوئلے سے لکیریں ڈال آپس میں بارہ گٹال، کھیل رہے تھے۔ ایک نے غلط ہی دوسرے کی کٹکری مار لی اور مہا بھارت شروع ہو گئی۔ وہ بنا سمجھے بوجھے بڑوں کی ٹھیٹ زبان میں ایک دوسرے کو گالیاں دینے، بال نوچنے لگے۔ باپ کی آہٹ پاتے ہی وہ ایک دم اپنے اپنے اردو کے قاعدے لیے دیے کی روشنی میں بیٹھ گئے، ادھر باپ نے آواز دی..... پڑھو اڈے پڑھو“ ادھر بڑے بچے نے پڑھنا شروع کیا..... ”وہ دیکھو، الو بولا“

تلو کے نے معاملہ فہمی کے انداز میں کہا ”میں سب جانتا ہوں، حرامیو!“ جس پر چھوٹا زور زور سے کہنے لگا ”بک بک مت کر، بک بک مت کر“..... اور تلو کا اس نئی تعلیم کو ایک ناقابل علاج بیماری سمجھ کر شک گیا۔

ان جڑواں بچوں، بنتے اور سنتے سے بڑی، پہلو نی کی ایک لڑکی تھی جس کا نام تلو کے اور رانو نے ہمیشہ کی سہولت کے لیے بڑی ہی رکھ دیا تھا۔ وہ دن بھر کام کاج میں ماں کا ہاتھ بٹاتی اور جب کچھ نہ ہو تو سب سے چھوٹے، سال بھر کے جنموں کو کھلانے لگتی..... ”دیر آیا کھیل کے۔ میں من پکاواں دیل کے“..... وہ محلے کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ گیند بھی کھیلتی جب بھی وہی بھیا اور وہی بھابی۔

”کوٹھے اُتے کتا، دیر میرا لہماں..... بھا بو میری پتلی، جھدے تک مچھلی“

اور ایسی ہی آس پاس کی چیزیں..... کتا، دیر بھابی، ناک کی مچھلی، لٹڈا پٹیل، تو دیاں

جیٹھ..... اس کی کائنات ابھی جیٹھ کے تصور تک ہی پھیلی تھی لیکن ابھی سب کچھ مہمل مہمل ہی تھا۔ البتہ گھر میں ایک اور تھا جو تیزی سے سمجھ دار ہو رہا تھا..... بڑی کا چاچا، ٹکو کے کاچھوٹا بھائی، رانو کا دیور..... منگل..... بے کار اور بدکار..... دن بھر اسے چھیڑ، اُسے چھیڑ، بار بار اپنے تہہ بند کو کس..... گھر آتا تو یوں کھانا مانگا جیسے سب اسی کی کمائی کا ہو اور بھابی رانی اندر سے خوش، باہر سے غصے میں کہتی..... ”دیتی ہوں مشنڈے!..... تیرے ہی لیے تو سب پکا ہے۔“

منگل، پانچ چھ برس کا بچہ تھا جب ٹکو کا رانو کو بچھٹھے، اس کے مائیکے سے لایا۔ رانی کے ماں باپ بے حد مفلس تھے۔ شاید اسی لیے انھوں نے چیخروں میں لپٹی ہوئی اپنی بیٹی کا نام رانی رکھ دیا تھا۔ جب وہ بڑی ہوئی پھری تو روٹی کپڑے کے وعدے پر اس کے ماں باپ نے اس کا ہاتھ ٹکو کے کے ہاتھ میں دے دیا اور خود عدم آباد کی طرف نکل گئے۔ رانو کو اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ اس کا آگاہ تو جیسا تیسرا بھی ہے لیکن پیچھا کوئی نہیں۔ کبھی تو ایسا وقت آ جاتا ہے جب ہر عورت گر کر پیچھے دیکھتی ہے اور جو نہ دیکھ سکے تو اسے آگے بھی نظر نہیں آتا..... رانی جب سے کوٹلے میں آئی تھی اسے ماں کے روپ میں ساس جنداں مل گئی اور باپ کی شکل میں سر حضور سنگھ، اور دیور منگل، جو اتنا چھوٹا تھا کہ بڑی کے پیدا ہونے پر اس کے ساتھ دودھ پینے کے لیے چل گیا۔ کچھ ہنستی، کچھ شرماتی ہوئی رانو نے اکیلے میں جب اسے پاس بٹھا کر کرتے میں سے چھاتی نکالی اور اس کی طرف بڑھائی تو وہ بھاگ نکلا..... منگل کو رانی ہی نے پالا۔ دنیا کی نظروں میں وہ اس کا دیور تھا لیکن رانی کی نگاہوں میں، اس کا سب سے بڑا بچہ، منگل بھی رانی کو ماں ہی سمجھتا تھا اور نہ وہ سگی ماں کو تائی کیوں کہتا؟ جب تو رانی اس کے کان بھی اینٹھ لیتی تھی، دھول دھپہ بھی کر لیتی لیکن اب پچھلے چند برسوں سے دنیا ہی بدل گئی تھی۔ نہ صرف بچے بڑے ہو گئے بلکہ منگل بھی آنکھیں دکھانے لگا اور کا شراب پینے، اور جنداں روایتی ساس کی شکل اختیار کرتے ہوئے بات بات پر کاٹنے لگی۔ اس

کی اصلی وجہ تو یہ تھی کہ آمدنی کے راستے مسدود ہو گئے تھے..... ادھر تلو کا ہفتے میں تین دن گھر میں ہی پڑا رہتا، ادھر حضور سنگھ کی آنکھوں میں موتیا بند اتر آیا اور وہ ہمیشہ چارپائی پر بیٹھا کانوں سے دیکھنے کی کوشش کرتا اور اس کی آنکھوں کے پوٹے صبح جو ہڑ میں نہانے والے کبوتروں کی طرح پھڑپھڑاتے رہتے۔

چھٹی کے دن ایک روز شام کے قریب تلو کے نے رانو کے پاس جا کر اپنے اریب کرتے کی جیب میں سے ایک ٹماٹر نکالا اور اسے رانی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا ”لے، ایک پیاز ڈال کے کاٹ دے۔“

رانی جو ترکاری پکا رہی تھی، تھم گئی ہاتھ کی کڑھی دیکھی میں ڈالتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ بولی..... ”پھر لے آئے میری سوت کو؟“

تلو کے نے جھینپتے ہوئے کہا ”روز تھوڑے ہوتا ہے رانو؟“

”روز ہو یا نہ ہو۔“ رانی کڑک کر بولی ”میں نہ پینے دوں گی۔ کہاں ہے تمہاری بوتل؟ آج میں دیکھ تولوں، اس میں کیا ہے جو مجھ میں نہیں۔“

تلو کا اسی بات سے ڈر رہا تھا کہ شور نہ مچے لیکن رانو نے وہی بات کی۔ دانت پیستے اور جھلاتے ہوئے تلو کے نے ایک نامردانہ سی کوشش کی۔ ”کتیے کنجریے!..... میں تجھ سے باگ کھینچ کر بات کر رہا ہوں اور تو ہے کہ چھوٹے ہی ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو گئی۔“

”ہاں.....“ رانی بولی ”بے شک گھوڑے پر تو ہی سوار ہو سکتا ہے دوسرا نہیں.....؟“ آج میں اس بات کا فیصلہ کر کے رہوں گی۔ آج اس گھر میں یہ رہے گی یا میں رہوں گی۔“

اور رانو بوتل ڈھونڈنے دوڑی۔ آنا فانا تلو کے کی آنکھ کا پانی مر گیا۔ اس نے بھاگتی ہوئی رانی کو اس کے اڑتے ہوئے بالوں سے پکڑ لیا اور ایک ہی جھٹکے میں اس کا پیڑا کر دیا..... دیے کی لوائیک بار بجھنے کے قریب ہوئی اور پھر سیدھی ہو کر کاٹنے لگی۔ بکائن پر بیٹھے ہوئے

تلیخڑاڑ گئے، ڈبو تن کے کھڑا ہو گیا اور پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھونکنے لگا۔ بڑی چلائی.....
 ”باپو۔“ بچے اندھیرا ڈھونڈنے اور چھپنے لگے۔ ایک تو موقع پا کر گھر سے بھاگ گیا، دوسرا
 ایک کونے میں جا لگا، دہشت کے عالم میں کاٹتا ہوا وہ ماں کے بجائے ”آں آں“ کہہ رہا تھا۔
 حضور سنگھ چارپائی پر سے لپکا، فریاد کے سے انداز میں گالیاں دیتا ہوا۔ ”اوائے پاپیا، اوائے بے
 شرما، اوائے بے حیا.....“ اور تنور پر گر کر جھلس گیا.....

پہلے ہلے میں رانی برابر آئی۔ اس نے اپنی بیتیسی تلو کے کے ہاتھ میں گاڑ دی تلو کے
 نے اور غضب ناک ہو کر، اسے بار بار دیوار کے ساتھ مارا اور وہ گالیاں دیں جو اس نے کبھی
 اپنے جانور کو بھی نہ دی ہوں گی۔

”مار ڈالا، ماں کو مار ڈالا“ بڑی چلا رہی تھی اور جب دادی باہر سے آئی تو بڑی کی
 شلوار گیلی ہو چکی تھی۔ جنداں آتے ہی بولی..... ”جانتی تھی..... میں جانتی تھی
 ایک دن یہ چاند چڑھنے والا ہے..... ہائے! یہ پٹری! داسوں کی اولاد..... جانے
 کہاں سے ہمارے گھر میں آگئی.....؟“

تو بیچ میں مت بول۔ ”منگل ماں سے کہہ اٹھا۔ وہ میاں بیوی کی لڑائی میں کسی کا بھی
 آنا ٹھیک نہ سمجھتا تھا اور خود ایک طرف کھڑا اپنے آپ کو روکنے اور سمجھانے کی پوری
 کوشش کر رہا تھا۔

”کیوں نہ بولوں؟“ بڑھیا بکے جا رہی تھی۔ ”اپنی کمائی سے پیتا ہے، اس کے باپ
 کینے سے تو مانگنے نہیں جانتا؟“ خود تو کھپ گیا، یہ گلج ۲ چھوڑ گیا ہمارے لیے.....“
 ماں کی شہ پا کر تلو کا اور بھی تند ہو گیا۔ اس نے رانی کے کپڑے پھاڑ دیے اور اسے
 یوں کر دیا جیسے ابھی پیدا ہوئی ہو۔ وہ زور زور سے چلا رہا تھا ”نکل جانکل“ جا میرے
 گھر سے۔“

رانو بے دم سی ہو کر کہے جارہی تھی ”میں نہیں رہوں گی، میں آپنی نہیں رہوں گی.....“ کچی دیوار کے پاس کچھ اجنبی سے چہرے اٹھے، اوپر کوٹھے پر کچھ عورتوں کے سایے سے ریٹکے..... ”مار ڈالا مار ڈالا.....“ ہائے نی کرئی بچاؤ ہائے نی یہ راکشش.....“

ایسی ہی آوازیں آرہی تھیں سبھی اوپر کلیجہاٹھائے کھڑی تھیں ”نیچے آنے رانو کو چھڑانے کی ہمت کسی کو نہ پڑتی تھی جب ہی کوٹھے کوٹھے ہوتی ہوئی جہلم ارا عین، اس کی بیٹیاں، پورن دئی برہمنی، نواب کی بیوی عائشہ، چنوں، ودیا، سرودپو سب ہی پہنچ گئیں لیکن ان سب میں صرف چنوں چلا رہی تھی۔ چھڑاؤ دے دے کوئی چھڑاؤ۔“

”کھبر دار جو کسی نے چھڑایا“ رانو اوپر دیکھتے ہوئے چلائی ”تم سب جاؤ..... جاؤ تم..... کیا تم کو نہیں پڑتیں؟“ اور پھر بولی ”آج جو ہوتا ہے، ہو جانے دو ایک بار..... آج دیوی کے کوٹھے میں بڑا من ہوگا۔ آج میں اس کے ہاتھوں مروں گی، سورگ کو جاؤں گی..... آج میرے بچے مجھے روئیں گے.....“

رانو عورتوں کو بھگاری تھی، بلا بھی رہی تھی۔

کہاں تو منگل ایک ضبط کے عالم میں سب کچھ دیکھ رہا تھا اور کہاں اب ایک ایکی لپک کر اس نے بڑے بھائی کا ہاتھ پکڑ لیا اور موٹی سی ماں کی ایک گالی دیتے ہوئے بولا ”لا..... اب لا ہاتھ نیچے، کہ ایک عورت ہی پر ختم ہو گئی شہ زوری؟..... ہل..... ہل اب اپنے باپ کا ہے تو؟“

تکو کے نے منگل کی آہنی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ کچھ بولنے بکنے لگا لیکن منگل کی نگاہوں میں قتل دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ منگل نے اسی پر بس نہ کی۔ آگے بڑھ کر اس نے زور سے بوتل کو ٹھوکر ماری اور وہ ٹوٹ گئی۔ شراب کی بو لپکی اور منڈیر پر کھڑی عورتیں، چھی چھی کرتی ناک پر کپڑا رکھتی ہوئی پیچھے ہٹ گئیں اور کچھ دیر

کے بعد چلی گئیں۔ پھر تلو کے کو یوں ٹھس ہوتے دیکھ کر منگل نے خود ہی اسے چھوڑ دیا۔ اور وہ..... تلو کا بکتا جھکتا ہوا اندر کو ٹھری کی طرف چل دیا۔ اب اس کی گالیوں میں پتھر نہیں، بنولے تھے جو ہولے ہولے دماغوں پر لگ رہے تھے۔ ان میں پہلی سی بے تکلفی نہ تھی۔ اب یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ زبان سے نہیں، کسی کتاب سے کچھ پڑھ کے سنا رہا ہے۔

رانو اندر جا کر ایک ٹرنکی میں کپڑے ڈالنے لگی۔ وہ جارہی تھی۔ کہاں جارہی تھی؟ یہ اسے بھی معلوم نہ تھا۔ وہ بس، جارہی تھی..... بیٹی تو کسی دشمن کے بھی نہ ہو بھگوان ذرا بڑی ہوئی ماں باپ نے سرال ڈھکیل دیا۔ سرال والے ناراض ہوئے، مایکے لڑھکا دیا۔ ہائے یہ کپڑے کی گیند، جب اپنے ہی آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہے تو پھر لڑھکنے جوگی بھی نہیں رہتی.....“

کپڑے تھے ہی کتنے؟ پل بھر میں ٹرنکی تیار ہو گئی اور پھر ایک دم رانو کو ٹھری سے باہر نکل آئی وہ خود روٹی، دوسروں کو رلاتی ہوئی بولی۔ ”لو جی سنبھالو اپنا گھر۔ یہاں ایک میں ہی مہمان تھی نا، سو جارہی ہوں۔ تم لے آنا کسی اور کو جو کرے مرے بھی اور تمھاری گالیاں بھی سنے۔ مار بھی کھائے اور ہڈیاں بھی تڑوائے“ پھر رانو کو سامنے بچے نظر آ گئے۔ غم اور غصے میں اندھی ہو کر جنھیں وہ بھول ہی چکی تھی..... ”بچے؟“ وہ خود ہی بول اٹھی۔ ”میں سمجھوں گی پیدا ہی نہیں ہوئے۔ سمجھوں گی مر گئے.....“

”بڑی نے پاس آ کر دوپٹے کا پلو تھامتے ہوئے کہا..... ”ماں!“ رانو نے ایک دم جھٹکے سے پلو کو چھڑا لیا اور بولی ”پرے ہٹ مردے! ایک دن تیرا بھی سی حال ہو گا.....“ اور وہ باہر کی بہت ہی وسیع و عریض دنیا کی طرف چل دی۔ اندھیرے کے کارن آسمان کے تاروں کے سوا اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُدھر ایک ایک ستارہ اپنی زمین جتنا بڑا تھا اور کئی زمین سے بھی بڑے..... جو سامنے کھڑے آنکھیں جھپک رہے

تھے۔ بیچ میں کالی بدلی آجانے کی وجہ سے دو جگہ کا چاند دو پھانک ہو چکا تھا.....

منگل نے بھاگتے ہوئے رانو کا بازو تھام لیا اور بولا ”بھابی! کہاں جائے گی؟“ اور پھر دہشت کے عالم میں پیچھے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”کسے رو کو تائی۔“

جداں ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولی ”جائے گی کہاں؟..... آگاہ پیچھا۔“

حضور سنگھ چلایا دھپے! آ رہے“ اور پھر اندازے ہی سے اس کی طرف لپکتے ہوئے پاس پہنچتے ہوئے اپنی پیٹھ پر سے کرنا اٹھا لیا اور وہ چھالے جو تنور پر گر کر تھلس جانے کی وجہ سے پڑ گئے تھے دکھاتے ہوئے بولا۔ ”میرا پنڈا تو دیکھ بیٹا۔“

رانو ابل پڑی۔ منہ پر دوپٹہ لیتے ہوئے بولی۔ ”باپو! جب تک تلو کے کانشہ بھی ہرن ہو گیا تھا۔ ایک یتیم لاوارث کی طرح وہ اندر سے آکر دروازے میں کھڑا ہو گیا اور اکھڑی سی آواز میں بولا ”جا..... جانہ، دیکھتا ہوں کہاں جاتی ہے؟“

”کہیں بھی جاؤں، تجھے اس سے کیا؟“ رانی روتے ہوئے بولی ”جہاں بھی جاؤں گی محنت مجوری کر لوں گی، اپنا پیٹ بھریں گی..... دور ویشوں کے لیے مہنگی نہیں کسی کو گانو بھر میں کوئی جگہ نہیں میرے لیے، دھر مشالہ تو ہے.....“

دھر مشالہ ”تلو کا چونک اٹھا..... ایک دم آگے بڑھتے ہوئے اس نے رانی کی ٹانگی پکڑ لی اور بولا ”چل..... مڑ پیچھے۔“

پیچھے؟..... آگے؟..... رانو، خود دار رانو بہت کچھ چھینی چھپی لیکن تلو کے کی طرح باتوں اب میں بھی کوئی دم نہ رہ گیا تھا۔ وہ کوئی بہانہ ہی چاہتی تھی جس سے وہ بھی رہ جائے اور عزت بھی..... اور اب جانے کا فائدہ بھی کیا تھا؟..... بوتل تو ٹوٹ ہی چکی تھی۔

ایک پاور بلی

(۲)

حضور سنگہ کے جلتے ہوئے بدن پر رابل لگا کر رانو لوٹ آئی۔ لکو کا ٹانگیں پھیلائے پڑا کچھ سوچ رہا تھا۔ سونے سے پہلے ننھا ایک بار رویا لیکن ماں کی چھاتی منہ میں دینے کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ لکو کے دماغ میں آج کے ہنگامے کی بجائے وہ جاترن گھسی ہوئی تھی اور رات بھر گھسی رہی۔ اندھیرے میں وہ خود مہربان داس تھا اور رانو جاترن۔ لکو کے لئے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو رانو نے جھٹک دیا۔

”ہی بچی!..... بالکل بچی!“ لکو کے نے کچھ کھینچا ہو کر کہا ”تو تو بالکل ایک بارہ تیرہ برس کی بچی کی طرح کرتی ہے۔ ویسے ہی دولٹی جھاڑنے لگتی ہے.....“

پھر لکو کا منت سماجت پر اتر آیا۔ وہ بھی ان مردوں میں سے تھا اندھیرا ہوتے ہی جن کی ساری انکڑ جاتی رہتی ہے۔ پھر اس نے اٹھ کر شیوجی کی تصویر نکالی جس میں وہ پاروتی کو پاس بٹھائے ہوئے تھے اور سر کی جٹاؤں میں سے گنگا بہہ رہی تھی۔ رانو کے پاس تصویر رکھ کر لکو کے نے شیوؤں کا واسطہ دیا۔ پاروتی کے امر پیار کی اتنی کیں لیکن رانو اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ پھر اس نے رادھے کرشن کی تصویر چوکھٹے میں سے نکالی..... وہ چوکھٹے سمیت بھی لاسکتا تھا لیکن وہ ہر تصویر کو چوکھٹے میں سے نکالے رہا تھا، جیسے وہ پوے ہوئے ہو یا ایسے ہی اس کے دماغ میں کوئی قاسد مادہ اڑ گیا ہو۔ کچھ پر بعد چوکھٹے ہی چوکھٹے رہ گئے۔ تصویریں بچ سے غائب ہو گئیں۔

رانو صبح اٹھی تو اس کا عضو عضو درد کر رہا تھا۔ وہ اٹھنا نہ چاہتی تھی لیکن گھر کا سارا

کام کاج پڑا تھا۔ شام کو کسی نے کچھ نہ کھایا تھا، اس لیے روٹی کی بھی جلدی تھی، پھر گھوڑے کے لیے دانہ بھگوانا، اس کا ساز نکالنا تھا۔ تلو کا ہمیشہ کی طرح ادھ موا پڑا تھا۔ آنکھیں بھی آدمی کھلی، آدمی بند، منہ پورا کھلا ہوا..... راتو اس کے پاس سے اٹھ کر دیے کے پاس گئی اور اسے ہاتھ میں لیے پھر تلو کے پاس چلی آئی..... اسی جذبے سے جس سے انسان مرے ہوئے سانپ کو دیکھنے کے لیے لوٹ آتا ہے۔

جب تلو کا اٹھا تو راتو گھر کا آدھا کام کر چکی تھی۔ اسے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کل شام کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس کے ہاتھوں سے ساز لیتے ہوئے تلو کے کاتھے پر پھر سے تیوری چڑھ گئی۔ اسے دیکھنے پر بھی یہی معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ رات اس نے معافیاں مانگی تھیں، نہ کان پکڑے تھے اور نہ ناک سے زمین پر لکیریں کھینچی تھیں۔ یوں بھی سورج کی کرنوں کے ساتھ ہی اس کی مردانہ اکڑ لوٹ آئی تھی۔ ساز کے تھامتے ہی اس کے گھٹکر و چھن چھن کر اٹھے۔ گھوڑی کی پروں والی کلنی میں ہوا کی ایک لہر دوڑ گئی اور تلو کا بولا ”یہ نہ سمجھنا میں تجھ سے ڈر گیا ہوں۔“

”میں کب کہتی ہوں؟“ راتو نے ٹالتے ہوئے کہا۔

تلو کا اس پر بھی چپ نہ ہوا..... ”عورتوں سے وہ ڈرتے ہیں جو نامرد ہوتے ہیں..... آج میں پھر لاؤں گا مٹھے مالٹے کی بوتل، دیکھوں گا تو کیسے روکتی ہے؟“

راتی کچھ نہ بولی..... البتہ دل ہی دل میں اس نے سوچا۔ آج یہ لایا مٹھے مالٹے کی بوتل، تو میں گلے کی ہولدی چالوں گی۔ بارہ سنگھے کا پورا سینک پیٹ میں گھونپ لوں گی۔ کتے کی گولی کھامروں کی جو اس دن بوڑی نے کھائی تھی..... پھر یہ کہینہ بھی ڈبو کی طرح ایک نظر مجھے دیکھ کے چھوڑ دے گا؟ ایک آدھ دھاڑ تو مارے گا ہی۔ میرے لیے نہیں تو اپنے بچوں کی خاطر..... نہیں نہیں..... کسی کا کیا جائے گا؟..... مر جائے گی ماں باپ کی بیٹی پر ماں باپ کہاں ہیں؟..... آگاہہ پیچھا..... میں نہیں مروں گی۔ ساں

خوش ہوگی، کہے گی..... سستے ہی میں جان چھوٹی.....
جب ہی منگل اپنے ایلے پن میں پاس سے گزر گیا۔ بھائی کے پاس پہنچا تو دونوں
مخافت کی نظر سے ایک دوسرے کو دیکھنے، غرائے لگے۔

”تیار ہو گیا ہے پٹھا“ تلو کے نے کہا اور خود ہی دم دبا کر اندر بھاگ گیا۔
منگل نے کوئی جواب نہ دیا اور باہر نکل گیا۔ بڑی ماں باپ کو ایک دوسرے کے
قریب آتے دیکھ کر محن کی طرف شک گئی اور چھوٹے بھائیوں کو مدر سے کے لیے تیار
کرنے لگی۔ دوسری کو ٹھری میں رات بھر کراہتا، جاگتا ہوا حضور سنگہ کہیں پچھلے پہر سو گیا
تھا۔ جنداں دبی زبان میں جب جی کا پاٹھ کر رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد اگلا سوار یوں سمیت گھر کے سامنے کھڑا تھا اور رانو ہمیشہ کی طرح
چار موٹی موٹی روٹیاں ایک میلے، روغن میں بے ہوئے کپڑے میں لپیٹ کر تلو کے کو دے
رہی تھی۔ رانو نے ایک نظر اسکے کی طرف دیکھا جہاں بارہ تیرہ برس کی ایک لڑکی کچھ ہوش
اور کچھ بے ہوشی کے عالم میں بیٹھی تھی اور چودھری مہربان داس کے کاسے اسے تھامے
ہوئے تھے اور شہر لے جا رہے تھے۔ رانو نے حیرانی سے پوچھا..... ”کون ہے.....“
”کیا ہوا اسے؟“

مرگی!“ تلو کے نے جواب دیا۔ وہ گھوڑے کی پیٹی کا بکس لگا رہا تھا۔

رانو نے ناک پر انگلی رکھتے ہوئے کہا ”مرگی؟“

”ہاں!“ تلو کا بولا ”مرگی..... جو ہر عورت کو پڑتی ہے..... رات تجھے بھی

تو پڑی تھی..... اور جس کا علاج جو تا ہے“ اور پھر اندر طاق کی طرف اتارہ کرتے

ہوئے بولا ”یادہ چھانچا جو میں آج لوٹ کر تجھ پر توڑوں گا۔ کل ہی تھو نے اس پر شام ۲

چڑھا کی ہے۔“

رانو کی ٹانگیں کاپنے لگیں۔ تلو کے کے جاتے، نظروں سے غائب ہوتے ہی اس نے پہلا کام یہ کیا کہ چھانٹے کو طاق پر سے اٹھا کر اندر بھنڈارے میں لے گئی اور اسے بھڑولی میں گیہوں کے نیچے، بہت نیچے کر کے چھپا دیا۔

ابھی دوپہر بھی نہیں ہو پائی تھی کہ سامنے، شاملات کی طرف سے کچھ آدمی دوڑتے ہوئے آئے جن میں نواب اور اسماعیل، ایکے والے بھی تھے۔ گیان چند..... پورن دئی کے شوہر اور دیوانا، چکی کے مالک کے پاس پہنچتے ہوئے نواب نے کہا ”اوئے پنڈتا سنا تو نے؟“..... اور پھر اپنا منہ پنڈت کے کان کے پاس کر کے کچھ کہا اور پھر سب مل کر چہ میگوئیاں کرنے، تلو کے کے گھر کی طرف دیکھنے لگے..... جب ہی جہلم کا دلماد مراد بخش دکان پر سے ایک ہاتھ میں ترازو اور دوسرے میں دوسری پکڑے ہوئے آیا اور شاہی..... جاٹ کو خانقاہ والے کنویں پر جانے سے روکنے لگا۔ پھر اس نے شاہی کے قریب ہوتے ہوئے کچھ کہا اور آخر وہ بھی دوسروں کے ساتھ مل کر تلو کے کے گھر کی طرف دیکھنے لگے..... رانو، دروازے میں کھڑی ان سب کے دیکھنے کو دیکھنے لگی.....

جنوں جو رانو سے رات کی صلح کے بارے میں پوچھنے آئی تھی اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔ ”بتا پھر کیا ہوا؟“

رانو نے اس کی توجہ سامنے ہونے والی سرگوشیوں کی طرف دلائی اور بولی ”ہائے نی..... آج ان مردوں کو ہوا کیا ہے؟..... سب کے سب اسی طرف دیکھ رہے ہیں.....“

”ہاں!“ جنوں نے دیکھتے ہوئے کہا ”جانتی ہے کیوں؟“

”کیوں؟“

”رات مار کھا کے بٹیاں تڑا کے تو اور بھی نکمر گئی تا“

”رٹڈیے..... کھسم کھا پیے“ رانی جنوں کو چوٹی سے پکڑتے، کھینچے ہوئے کہا اور

پھر دونوں ایک دوسرے کے کو لھوں میں چسپے دینے کلکاریاں مارنے لگیں۔

رانو کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب اس نے چودھری مہربان داس، اس کے بھائی گھنٹام کو جھکڑیاں لگے بازار میں سے گزرتے ہوئے دیکھا لیکن..... ساتھ اٹھارہ انیس برس کا ایک نوجوان لڑکا بھی تھا جس کے کپڑے خون سے تر ہوتے تھے۔ اس کے منہ، سر، ہر جگہ پر خون ہی خون دکھائی دے رہا تھا اور وہ کچھ ہوش، کچھ بے ہوشی کے عالم میں حوالدار جہان خان اور نمبردار تارا سنگھ کے سہارے آگے بڑھ رہا تھا۔ مہربان داس کا رنگ ایک دم سیاہ ہو جانے سے اس کے کانوں میں بڑی نیساں چمکنے لگی تھیں۔ گھنٹام کے ماتھے پر بڑے بڑے نیل دکھائی دے رہے تھے اور صافہ پوں گلے میں پڑا تھا جیسے اسے باندھنے کی فرمت ہی نہ ملی ہو اور یا پھر لڑائی جھگڑے میں کھل گیا ہو۔

”شکر ہے۔“ رانو بولی ”میں تو آج گڑبانٹوں کی چنی..... ہر کسی کے بننے کی بجائے یہ آج سرکار کے جنوائی بنے ہیں۔“

چنوں نے کوئی جواب بھی نہ دیا تھا کہ رانو نے ناچتے اور تالیاں بجاتے ہوئے کہا ”میں تو آج ناچوں گی کدھلا ڈالوں گی.....“ اور پھر دروازے ہی میں سے مندر کے کلس کی طرف دیکھتے اس کی طرف ہاتھ جوڑتے ہوئے وہ بول اٹھی.....

”شکر ہے دیوی ماں..... آج تو نے سن لی میری..... آج کا دن تو دھقیہ ہو گیا میرے لیے.....“

جب ہی تلو کے کا اکا دکھائی دیا لیکن اسے گورداس چلا رہا تھا..... ”ہائے نی!“

رانو نے چنوں سے کہا اور پھر اسی طرف دیکھنے لگی۔

اکے کے اندر کوئی لیٹا ہوا تھا۔ رانو نے سوچا..... شاید اس مرگی والی لڑکی کو کچھ ہو گیا؟ پھر سب سواریاں مل کر اس لڑکی کو اتارنے لگیں۔ جب اسے پاس لائے اس کے منہ

سے کپڑا ہٹایا گیا تو رانا ایک دم چلائی..... ”نہیں“..... اور پھر اندر کی طرف بھاگ گئی اور چٹوں سر اور چھاتی پیٹتے ہوئے اپنے گھر کی طرف۔

لگو کا قتل ہو گیا تھا!..... خانقاہ والے چاہ کے قریب اس نوجوان جاترن کے بڑے بھائی نے اسے پکڑ لیا تھا اور اس کی شہ زگ میں دانت گاڑ دیے..... اور اس وقت چھوڑا جب اس کے بدن میں خون کا ایک بھی نمکین قطرہ نہ رہا.....

جس وقت لوگوں نے اسے پکڑا وہ نوجوان وحشت کے عالم میں آنکھیں پھیلائے دونوں ہاتھوں کو اوپر اٹھائے مندر کے کلس کی طرف دیکھتا ہوا ایک مذہبی غیظ و غضب، ایک جنون کے عالم میں چلا رہا تھا..... ”تیرے نعمت..... ہے دیوی ماں! تیرے نعمت.....“ اور ہو لوگ اسے مارتے دھاڑتے ہوئے لے جا رہے تھے، اور وہ ایک بلند آواز میں دیوی ماں کی بھینٹیں مگ رہا تھا۔

ماتا رانی دے دربار جو تاں جگدیاں

میا رانی دے دربار جو تاں جگدیاں

ماتا رانی کے دربار میں جوتیں جل رہی ہیں امیتا رانی کے دربار میں جوتیں جل رہی ہیں..... اور ان جوتوں کی چمک اس کی پھیلتی کانچ ہوتی ہوئی آنکھوں میں چلی آتی تھی۔ بیچ میں اس کا رنگ ایسا کی پیل پڑ جاتا اور پھر ایک دم لال، کیسری ہوا لٹتا۔ جب ہی ہر لمحہ بڑھتے ہوئے لوگوں کے جھوم کے ساتھ وہ مندر کے پاس پہنچ گیا۔ پھر اس نے کود کود کے اچھل اچھل کے، لپک لپک کے گانا شروع کر دیا۔

ہے میا! تیں سیئے بھیناں گوریاں

سر لال بھلاں دیاں جوڑیاں

میا رانی دے دربار..... جو تاں جگدیاں

اے میا! تم ساتوں بھینیں گوری ہو۔ تمہارے سر پر لال پھولوں کی جوڑی ہے

..... پورہ اپنے خون میں بے ہوئے کپڑوں کو نچوڑ نچوڑ کو لہوا اپنے سر پر مل رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دیوی کی روح اس میں چلی آئی ہے اور ایک انتقامی جذبے سے اپنا روپ کرپ اور آنکھیں آگ بھجھو کا کیے، بھیروں یا تلو کے کی طرف دیکھ رہی ہے.....

پھر وہ ڈنڈوت کے انداز میں مندر کے دروازے پر لیٹ گیا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا..... لوگ ڈر سے کانپتے ہوئے اسے چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ وہ چاہتا تو اسی جنون کے عالم میں چلاتا بھینٹیں گاتا ہوا کہیں بھی نکل جاتا لیکن کچھ دیر بعد اس نے خود ہی اپنے آپ کو نمبردار تار سنگھ کے حوالے کر دیا..... یہ بھی اس کے جنون ہی کا ایک حصہ تھا۔

آس پاس کے پندرہ بیس گانو سناٹے میں آگئے۔ کوئلے بھر میں کھرام مچ گیا۔ بے امو سے بادلوں نے سورج کی آب و تاب کم کر دی اور وقت سے بہت پہلے اندھیرا چھا گیا ویشنو دیوی مندر کے گلس تلو کے کے گھر میں جھانکنے لگے۔ بکائن نے پیتاں سمیٹ لیں اور ڈبوتے رونے بھونکنے کی بجائے اپنی دم ٹانگوں میں سیٹر لی۔

حضور سنگھ کی آنکھوں میں پر ماتما نے ایک ایسی روشنی دے دی..... بیٹے کی لاش دیکھنے کے لیے!..... جنداں غش کھا کر دس بارہ گھنٹے کے لیے بچوں کی چٹلاہٹ سے گزر گئی۔ رانو باہر دوڑ ٹٹی، پھر اندر چلی آئی پھر باہر اٹھ دوڑی..... اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا۔ نہ معلوم کیوں اسے گھر کے سب زیور، سب کپڑے پہننے کا خیال چلا آیا۔ وہ نہ غم کرنے والی تھی کہ جنوں نے پکڑ لیا اور اس کے ہاتھ دیوار سے مار مار کر چوڑیاں توڑنے لگی۔ پورن دلی باہر سے مٹی کی مٹھیلیاں بھر کر لائی اور رانو کے سر پر خالی کر دیں لیکن رانی اب تک کچھ نہ سمجھی۔ وہ پھر اندر لپکی اور بھندارے میں جا کر گیہوں کے ڈھیر میں یوں ہاتھ مارنے لگی جیسے حاملہ کتیا چونہ چونہ کرتی ہوئی پنچوں سے زمین کے پڑے تک کھود ڈالتی ہے..... رانی نے وہی شام لگا چھانٹا نکال لیا اور اسے لے کر باہر سب کے سامنے چلی آئی اور کسی اندھے جوش سے اسے تلو کے کو دکھاتے ہوئے توڑ دیا اور بولی.....

”لے میں نے توڑ دیا تیرا چھانٹا..... بڑا مجھ پر توڑنے آیا تھا.....“

سب سمجھے رانی پاگل ہو گئی ہے۔ رانی پاگل ہو گئی تھی اور نہیں بھی۔ بڑی دیوار کے ساتھ کھڑی پہلے ہی چیخ پکار کر رہی تھی۔ اس پر رانو نے اس کے پاس جا کر سر پر ایک دوہتر جڑ دیا اور بولی ”سب پہ گڑے پڑتے ہیں، سب کو سیتلا نکلتی ہے، سب مرتی ہیں، ایک تو نہیں مرتی.....“ ”وڈیا نے بچ میں آکر بڑی کو چھڑا لیا..... اس غریب کا کیا قصور تھا؟ قصور کیوں نہیں؟ کیوں وہ ایسے باپ کے گھر پیدا ہوئی تھی جو اس کا رہن چھڑائے بغیر ہی چلتا بنا..... پھر چوکھٹ پر کھڑی رانو کو ایک بل کے لیے خیال آیا.....“ ”رودے رودے کشتیے؟ نہیں تو جمانہ تجھ پر ہنسے گا..... ہنسے گا!“ لیکن رونا تھا جو کسی طور نہیں آ رہا تھا۔ ایک انکی رانو کو اپنے بچے کسی کے بچے معلوم ہونے لگے۔ اپنا گھر، کسی کا گھر..... وہ پھر اندر گئی تاکہ پیاز ہی کوٹ کر اس کا پانی آنکھوں میں ڈال لے اور رودے..... رودے..... آخر اس کی ضرورت نہ پڑی..... سامنے رکابی میں وہ ٹماٹر پڑا تھا جو تلو کارات مٹھے مالے کے ساتھ کھانے کے لیے لایا تھا۔

..... اب رانی کے بندھ ٹوٹے۔ وہ رو رہی تھی، بین کر رہی تھی۔..... اور سر پر دوہتر مار رہی تھی اور گانوں بھر کی عورتیں زار زار روتی ہوئی اسے روک رہی تھیں..... رانی کے بینوں نے ساتوں آسمانوں میں چھید کر دیے، منگل چلا اٹھا..... ”مان!“ اور پھر دیواروں کے ساتھ اپنا سر پھوڑنے لگا۔ رانی چلا رہی تھی..... ”رانی بندھیے! تیرا بچہ چاند آگیا..... ہائے رنڈیے! تیری شکل تو اب باجار بیٹھنے والی بھی نہیں، اب تو تو پیشہ کرنے جوگی بھی نہیں.....“

(۳)

چودھری مہربان داس، اس کے بھائی گھنٹام اور باداہری داس..... سب کو سات سات سال کی قید سخت کی سزا ہو گئی تھی۔ ساتھ جاترن کے بڑے بھائی اس کے لڑکے کو بھی اتنی ہی، کیوں کہ لوگ مقتول کی لاش کو نمبردار تارا سنگھ اور حوالدار جہان خان کے پہنچنے سے پہلے، موقع پر سے لے جا چکے تھے، اور وکیل صفائی قاتل کے سلسلے میں ناگہانی اشتعال ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن..... باداہری داس کو اتنی لمبی سزائیوں.....؟ اس لیے کہ اس کا لوہے کا لنگوٹ بوسیدہ سے کپڑے کا نکل آیا تھا۔ باداہری داس کو ایسی عبرت ناک سزا سن کر، کوٹلے کی سب عورتیں چپ ایک دوسری کے منہ پر کچھ ڈھونڈنے لگیں۔ پکڑی گئی تو پورن دئی برہمنی، جو سب سے زیادہ باتیں کرنے کی عادی تھی اور جس کے منہ سے ایسا ایسا ہانکل آئی تھی اور آنکھوں سے آنسو..... لوگ کہتے تھے جب تک گانو پر مندر کی چھتر چھلایا ہے اور دیادھرم والے لوگ جوہڑ کے کنارے ہڑ کر آ بیٹھنے والے کو تروں کو دانہ نہ کاڈالتے ہیں کوٹلے میں کوئی پاپ نہیں ہو سکتا۔ ہو گا بھی تو اس کی پوری سزا ملے گی جیسی کہ بھیروں کو ملی تھی۔

چودھریوں کی حویلی، جائیداد زمین وغیرہ سب مقدمے میں گئے۔ دھرم شالہ پنچایت کے عمل میں چلی آئی۔ اس سانحے کے بعد لوگ اتنے چوکے ہو گئے کہ ان میں سے کسی کی بھی ہمت عورت کو سامنے سے دیکھنے کی نہ پڑتی تھی البتہ گانو کی گنج گانیاں جب اپنی مستی میں نکل جاتیں تو سب انھیں پیچھے کی طرف سے جاتے ہوئے دیکھتے اور نظروں سے

ان کے اٹھتے گرتے کو لھوں کے ساتھ تال دیتے اور کچھ دیر میں تال تک دینے کی ہمت نہ رہتی۔

حضور سنگھ کی ہڈیوں تک میں پانی پڑ گیا تھا۔ وہ چارپائی پر بیٹھا، بڑھیا کی گالیاں سنا کرتا۔ جنداں اسے ایک دن رو بیٹھنے کی منتظر تھی۔ کوئی زمانہ تھا جب حضور سنگھ نے اس عورت کو راج کرایا تھا۔ بڑے بڑے شہروں کے چڑیا گھر اور تو تامل دکھائے تھے لیکن اب وہ بے کار، بے یار و مددگار، گھر میں پڑا کرتھ صاحب کے نویں محل کے شبد گنگلیا کر تاجودنیا کی بے ثباتی کی تفسیر میں لکھے گئے تھے اور حضور سنگھ کو ایک عجیب طرح کا حوصلہ اور ہمت دیتے تھے۔ جنداں رات دن کے چوبیس گھنٹے چمکا کرتی۔ رانی کو تو دیکھتے ہی بڑھیا کے بدن کے سارے تھکے کھڑے ہو جاتے اور وہ رانی پر اپنی گالیوں کے چھاجوں کے چھاج خالی کر دیتی۔..... رنڈیے! ڈانٹے! چڑیلے!..... میرے بیٹے کو کھا گئی اور اب ہم سب کو کھانے کے لیے منہ پھاڑے ہوئے ہے؟..... چلی جا..... جدھر منہ کرنا ہے کر لے اب اس گھر میں کوئی جگہ نہیں تیرے لیے۔“ رانو ایک پل کے لیے بھی وہاں نہ رہتی لیکن..... پانی من، جو ایک جالے کی طرح بچوں کے ساتھ لپٹا ہوا تھا، اسے کچھ بھی نہ کرنے دیتا۔ جتنا جنداں اسے گھر سے نکالنے کی کوشش کرتی اتنا ہی رانو اس کے پانو پکڑتی۔ زندگی میں یوں ایک ایسی بے قیمت ہو جانے سے..... زری سے ڈھلنے لگی۔ جو چیزیں اس کے بدن میں کم ہو رہی تھیں وہی بڑی کے جسم میں بڑھنے لگیں۔ وہ پر پھل..... جنگل کے پھول کی طرح اوپر، نیچے، دائیں، بائیں، سب طرف بے تحاشا کھلنے لگی۔ کبھی اس پھول کی ایک پتی گر بھی جاتی تو اس کی جگہ دو اور نکل آتیں۔ اپنے آپ سے بے خبر وہ اچھلتی کودتی، چاندنی رات میں لڑکوں کے ساتھ کھیلنے نکل آتی۔ دیر سے گھر لوٹنے پر دھان کی طرح پھٹک دی جاتی لیکن اس پر جیسے کوئی اثر ہی نہ ہوتا۔ کچھ غریبی کی وجہ سے اور کچھ جان بوجھ کر رانو اسے پھٹے پرانے، تیل اور بساند میں رے رے ہوئے کپڑوں میں رکھتی۔ بال بنانے کی بجائے

بکھیر دیجی تاکہ اس پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ بڑی گوری چٹی تھی اور پورو کے الفاظ میں اس پہ کسی ”رنگیج“ کی اولاد ہونے کا شبہ پڑتا تھا۔ جب کوئی میلی نظر سے بڑی کی طرف دیکھتا تو رانو مرنے مارنے پر تیار ہو جاتی اور پھر سب باتوں سے نپٹ کر پکارا اٹھتی۔

گورارنگ نہ دیکھیں دے رہا

سارا پنڈ ویر پے گیا

گورارنگ نہ دیکھو پر ماتا! سارا گانو پیری ہو گیا..... رانو جتنا بڑی کو چھپانے کی کوشش کرتی اتنا ہی اس کا جو بن ان میلے اور بوسیدہ کپڑوں میں سے پھٹ کر سامنے چلا آتا۔ وہ اس معصوم اور متحیر بچے کی طرح تھا جو باجے کی آواز سنتے ہی بے اختیار کھڑکی میں آکھڑا ہوتا ہے۔ بڑی کو یوں انجان اور بے خود دیکھ کر رانو سر ہلا دیجی اور کہہ اٹھتی..... اس بے باپ کی بیٹی کا انت بُرا ہے جس دن کسی دشمن کی اس پر نظر پڑ گئی یہ کہیں کی نہ رہے گی..... اور مارے ڈر کے رانو کا پنے لگتی۔ اسے سیلان کی بیماری ہو گئی اور بدن کی چربی یوں گھلنے لگی جیسے جتے توے پر مکھن کی ڈلی گھلنے پھلنے لگتی ہے۔

رانو کے حساب سے بڑی دن بدن اپنی تقدیر کی تاریخ کے نزدیک پہنچ رہی تھی۔ پچھلے ماگھ کی سکرانت سے رانو کو بڑی کے نہانے، کا حساب رکھنا پڑ رہا تھا۔ کہیں دو دن بھی اوپر ہو جاتے تو رانو اس سے عجیب طرح کے اٹے سیدھے سوال پوچھنے لگتی۔ ”تیسرے پہر کو تو کہاں تھی؟ پھر ایشراں کے ہاں سے کہاں گئی؟ مندر میں کون کون تھا؟ کیوں تو پر دہت سے گورو منتر لینے بیٹھ گئی؟ جانتی بھی ہے یہ منتر تجھے کہاں پہنچائے گا؟ بھول گئی باواہری داس کو.....؟“ پھر وہ احتیاطاً گھر میں کاڑھا لار کھتی..... جھوٹ اور کفر کو ابال بھینکنے کے لیے..... جب کہیں دھڑکتے پھڑکتے ہوئے انتظار کے بعد اس بلوغ کے بوٹے پہ کوئی نیا گل اتار کھل اٹھتا تو رانی کی جان میں جان آتی اور بڑی کو جلدی جلدی گھر سے نکال

دینے کی سوچ میں لگ جاتی لیکن گھر میں تو بیس کوڑیاں نہ تھیں اسے رخصت کرنے، اپنے گھر بھیج دینے کے لیے..... پھر رانو سوچتی..... وہ خود بھی تو روٹی کپڑے کے وعدے پر چلی آئی تھی لیکن..... پاپی پر ماتمانے جب اس کی بچی کو زندگی کی سسرال میں بھیجا تو روٹی کپڑے کا بھی وعدہ نہ کیا..... گانو کے نوجوان لڑکے، ہر دوسرے تیسرے شام ڈسکے جا کر سینما دیکھنے والے حرامی، بہن اور عورت میں بھی تمیز کرنے کے قابل نہ رہے تھے اتنا تو انھیں سمجھنا چاہیے تھا کوئلے کی سب لڑکیاں ان کی بہنیں ہیں اور عورتیں مائیں..... اس پر بھی رانو ان میں سے کسی کے ہاتھ میں بڑی کا ہاتھ دے دیتی اور خود اس کے سارے حساب کتاب، اس ڈر سے چھٹی پالیتی لیکن وہ لچے، بد معاش، سب کے سب مہر کرم دین کے باغ میں سے کھٹے توڑ، کچھ کھا، کچھ پھینک کر بھاگ اٹھنے والوں میں سے تھے۔ ان کی رکھوالی کرنے والا کوئی نہ تھا..... جانے بڑی کی قسمت میں دیروال تھا یا ڈسکہ بڑھا گورا پایا جا کی..... یادور لاہور، پشاور.....؟ رانو بیٹھی سوچ کے گزروں سے جدائیوں کے فاصلے ناپتی اور پھر ایک عجیب عمل سے کھینچ کھینچا کر انھیں سکیرتی، چھوٹا کر لیتی..... اس پر بھی اسے جھر جھریاں آتیں۔ بڑی کی مدد سے وہ اس کے دیج کا کشیدہ کاڑھتی ہوئی گنگٹانے لگتی۔

بجناں ساہورے چلنا، سبھ مکلا دن ہار

ایک دن سب کو اپنی سسرال چل دینا ہے۔ ایک دن سب کا گونا ہو گا لیکن اس کا اپنا گونا؟..... اس کی اپنی سسرال؟..... جواب مانگہ ہو چکی تھی..... دماغ اور کشیدے کی اسی ادھیڑ بن میں رانو یہ بھی بھول جاتی وہ گیت زندگی کا نہیں موت کا تھا!..... پھر جیسے اپنے آپ، ایک ایسی رانو کی صحت ٹھیک ہونے لگتی۔ بدن میں ایک عجیب طرح کا تناؤ پیدا ہو جاتا جو اس کے دماغ تک کی طنائیں کھینچ ڈالتا اور رانو کا من سسرال جانے کے لیے تڑپنے لگتا۔ رانو جب سے کوئلے میں آئی تھی تلو کے نے اسے سسرال کے

بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہ دیا تھا۔ سرال نام ہوتا ہے سات پردوں میں لپٹی لپٹائی آنے والی دلہن کا، اس کے سواگت کے لیے گھر کی چوکھٹ پر سرسوں کا تیل گرانے کا پیچھے ہاجوں، آگے نظروں کے ٹھٹھے کا، ساس کے چاؤ کا سر کے ملہار کا ”گانی“ کھیلنے کا برتن بدلنے کا، منہ دکھائی اور پھر رات مویا کرنے کے پھولوں کا، دیے کی روشنی میں سمٹنے اور پھر کھل جانے کا، ایک بہیمیت کے ساتھ ساتھ ایک اتھاہ مادریت کا..... لیکن تلو کا جہاں اسے ہر روز دلتا، روئے دلتا ہوا لے جاتا تھا۔ وہ تو سرال نہ تھی جس میں ہر لڑکی شادی کے بعد جانا چاہتی ہے۔ ہر عورت بیاہ کے برسوں بعد بھی جانا چاہتی ہے..... رانو ایک ایسی سرال اور گونے کے لیے جاگ اٹھی لیکن سرال اور گونا تو اس کی بیٹی کا ہونے والا تھا نہ معلوم اپنا یا بیٹی کا..... بیٹی کا..... اپنا..... اور رانو کا وہی گیت ایک نوجوانے میں ڈھل جاتا۔ جنداں کی گالیاں اور دُور دُور جسے اور دل دوز بنا دیتیں اور وہ گانے لگتی.....

”چترئے سہیلوی، چتر و سا تھی ٹال“ سہیلی اس وقت تک بس سکے گی جب تک سا تھی اس کے ساتھ ہو گا۔ جسم اس وقت تک کام کرے گا، جب تک روح اس کی رفاقت کرے گی۔

اس پر وہ اوہاں..... منگل اور وہی اس کا نصیبوں والا اڈہ۔ منگل نے بکی پر ساز لادنا تو سیکھ لیا تھا لیکن خود پہ گھر کی ذمے داری کا جوانہ پڑنے دیا۔ آمدنی پہلے سے بھی کم ہو گئی۔ زندگی میں ایک ایسی چوٹ کر جاگا ہوا منگل، جذبات و شہوانیات کے جنگل میں کھو گیا ابھی وہ زندگی کے سیاق و سباق سے اچھی طرح واقف نہ ہوا تھا لیکن اسے ”جائینا است“ کا احساس ضرور تھا۔ جب بھی کوئی کنواری سامنے سے گزر جاتی تو جیسے اپنے آپ یہ بول اس کے ہونٹوں پر چلے آتے۔

نئے دیے بند بوتلے، تینوں پن گے نصیبوں والے

اے نئے کی بند بوتل! تجھے نصیبوں والے پیسے گے..... اور نصیبوں والے

اڈے پر اکا ہانے والا منگل یہ بھول ہی جاتا، گھر کی طرف سے بھی اس پر کوئی فرض عائد ہوتا

”اڑیا مشکل“

۱۔ لڑے ۲۔ ہانڈی

شام کو منگل گھر پہنچا تو اپنے اہل چھوٹے سے دوستی کی قسط سالی دیکھ کر سارا مشق بھول گیا۔ صبح سے کھانا نہ پکا تھا۔ بڑی نے کچھ چاول اُبالے تھے لیکن بھوکے رانوں نے انھیں ملایا پہ ڈالا اور بنامک مرچ کے کھا گئی، سوکھے عی نکل گئی۔ ساس سر تو ایک طرف اس نے اپنے بچوں کو بھی نہ پوچھا تھا اور اب جدا ہاں اسے دھکے دے دے کر باہر نکل رہی تھی..... اور رانی پھر بنی مار کھا رہی تھی۔ وہ چاہتی تو ایک عی ہاتھ سے بوڑھی جدا ہاں کے جسم کا رشتہ اس کی روح سے علاحدہ کر دیتی لیکن وہ چپ تھی اور ایک انجانے ڈر سے کانپے جا رہی تھی..... منگل اس منظر کو دیکھ کر ایک بحرمانہ احساس سے بکائن کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ آج اس نے صرف تیرہ چودہ آنے بنائے تھے جو گھر کے نون تیل کے لیے بھی کافی نہ تھے۔ اُسے الٹی طرف کی ایک سواری ملی تھی جو روپیہ سو روپیہ دینے کو تیار تھی لیکن سلاحتے کے لالچ میں وہ جلدی ہی گاٹو لوٹ آیا۔

منگل نے جدا ہاں کے ہاتھ روکتے ہوئے کہا..... ”تائی..... کیوں تو روز اس گریب کے ساتھ ایسا سلوک کرتی ہے؟ کیوں روز مارتی، دھکے دیتی ہے۔ آخر کہاں جائے گی بچاری۔؟“

رانو جسے اپنے شوہر کے مرنے پر روانہ آیا تھا، ایک دم ہلک اٹھی اور تھوڑی عی دیر میں وہ اپنے آنسوؤں کے سیلاب میں کچھ یوں ڈوب گئی کہ لڑھکنے جوگی بھی نہ رہی۔ وہ رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی..... ”میں کیوں جاؤں؟..... کیا نہیں کیا میں نے اس گھر کے لیے؟ بیٹے نہیں جنے کہ بیٹی نہیں جنی؟.....“

منگل بولا..... ”قصور بھابی کا نہیں، میرا ہے۔“

”تیرا خولہ تھوڑی ہی؟“ جدا ہاں کڑکی..... ”جو عورت اپنے بچوں کی نہیں وہ اور کس کی ہوگی؟“ اور پھر رانو کی طرف منہ کرتے ہاتھ جوڑتے ہوئے وہ بولی ”گرو کے واسطے، بھگوان کے واسطے، دیوی ماں کے واسطے تو اب جا..... دکان ہو جا۔ جو اندھا کانا

”ہے کر لے..... یہاں سے مر لے.....“

رانو اٹھی، مڑتی ہوئی اس نے جنداں کو ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو تو تو جنتی ہے ماں..... جگت ماما ہے تو تو مجھے مت دھکڑ جیسے نیسے بھی ہے مجھے رکھ لے۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں..... اور اسی ڈر سے وہ سب کے حصے کا کھا گئی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا..... اس گھر میں رہے بھی تو کیسے؟ بچے اب پل چکے تھے، بڑے ہو چکے تھے اور قاعدے سے اب وہ تلو کے تھے، اس کے تھوڑے ہی تھے؟ ساس، سر گانو میں پنچایت کے لوگ لے جانے بھی دیتے تو وہ ان کو لے کر کہاں جاتی؟ خود بھیک مانگتی؟ ان سے بھیک منگواتی؟ پھر..... بنتا، سنتا اور بڑی، ہر ایک سے وہ ایک ہی سا پیار کرتی تھی۔ اب بھی وہ اس کی دیکھ رکھ کے محتاج تھے۔ ایک کو چھوڑنے..... کا خیال کرتی تو دوسری پہلی میں درد ہونے لگتا، اور وہ سب اتنے چھوٹے نہ تھے کہ ساتھ لے جاسکتی، اتنے بڑے نہ تھے کہ چھوڑ سکتی..... ساس کے اٹھتے جوتا، بیٹھتے لات کے عمل میں رانو بھی اب یہی سمجھنے لگی تھی جس عورت کا ہنسی مر جائے اسے اس کے گھر میں رہنے کا کوئی حق نہیں، اس دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر ایک صبح چنوں آئی اور گلے میں بانہ ڈال کر اپنے گھر لے گئی۔ ساگ کے ساتھ مٹی کی روٹی کھلائی جو رانو نے اس ڈر سے تھوڑی کھائی کہ پھر نہ ملے گی اور پھر چنوں موٹا حاسر کا کر رانو کے پاس بیٹھ گئی اور بولی ”دیکھ بی بی! میں تجھ سے ایک بات کہتی ہوں جو مانے تو.....؟“

رانو نے چنوں کی طرف دیکھا۔

چنوں شروع ہوئی ”یہ جنداں بندی، ساس تیری تجھے جینے نہ دے گی۔ اس گھر میں بسنے نہ دے گی..... یہاں رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے.....“

”کیا طریقہ؟“ رانو نے جاننے سے پہلے ڈھارس پاتے ہوئے کہا۔

”وہ یہ کہ تو..... منگل سے شادی کر لے، چادر ڈال لے اس پہ۔“

”نہیں“ رانو ایک دم کھڑی ہو گئی ”یہ تو کیا کہہ رہی ہے چنوں“

”ٹھیک کہہ رہی ہوں..... جب بڑا بھائی پورا ہو جائے تو.....“

”یہ نہیں ہو سکتا“ رانو نے کہا اور اس پہ ایک لرزہ چھانے لگا۔ منگل..... بچہ

ہے۔ میں نے اسے بچوں کی طرح پالا ہے..... عمر میں مجھ سے کچھ نہیں تو دس گیارہ

سال چھوٹا ہے..... نہیں نہیں، میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتی.....“

اور رانو گھر بھاگ گئی.....

منگل بکی کے لیے دانہ لے جا رہا تھا، جب رانو گھر پہنچی۔ اندر جاتے ہوئے رانو نے

مڑ کر ایک نظر منگل کی طرف دیکھا اور پھر ایکا اکی، اپنے آپ ”نہیں نہیں..... نہیں

نہیں“ کہتی ہوئی چل دی۔ خود کو جھٹکے میں گرا، منہ چھپا کر رونے لگی۔

کھڑی بھر کے بعد منگل ساز لینے کے لیے اندر آیا۔ آج وہ جلدی نکل جانا چاہتا تھا

کہ گھر میں چاول ہی نہیں گے ہوں بھی آئیں اور موٹی سی روٹی پکے جیسی کہ پکا کرتی تھی اور

جس سے اصل میں پیٹ بھرتا تھا۔ چاولوں کا کیا ہے؟ وہ تو سیدھے پیشاب کے راستے سے

نکل جاتے ہیں اور پھر پیٹ خالی، رب والی..... ہو سکے تو ایک آدھ ترکاری بھی

ہو جائے۔ جس کے سوا گت کے لیے منہ کی سڑک پر ابھی سے چھڑکاؤ ہونا شروع ہو گیا

تھا۔ کچھ نہ ہو تو روٹی کے ساتھ پیاز ہی سہی یا پھر لہسن کی کچھ بھریاں، دویا کے ہاں سے لسی

آہی جائے گی اور اس میں نمک اور لال مرچ ڈال کر روٹی کھالی جائے گی..... ان سب

باتوں سے زبان اور تالوئل کرا بھی سے چٹاخ چٹاخ کرنے لگے..... ایک ہاتھ سے ساز

کا گور کہ دھند اسمیٹ کر منگل نے رانو کی طرف دیکھا اور بولا

”کتنی کہاں ہے گھوڑی کی؟“

رانو ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھی۔ پہلے تو اس نے سیدھے منگل کی طرف دیکھا

اور پھر ایک انکی گھبرا کر دوسری طرف جھانکتے ہوئے بولی..... ”بچے تو گئے مدر سے۔“
منگل نے حیرانی سے رانو کی طرف دیکھا اور کہنے لگا ”حد ہو گئی بھئی۔ میں چتر متری
بکلی کی بات کر رہا ہوں اور تو بچوں کی!“..... اور پھر یہ دیکھنے کے لیے کہ رانو کو ہوا کیا ہے
اس نے آگے بڑھ کر اسے چھو دیا۔ رانو بکلی کی سی تیزی کے ساتھ کھڑی ہو کر چلا دی۔
”مت ہاتھ لگا مجھے“

منگل نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا اور اپنی انگلیوں کی پوزوں کو دیکھنے لگا۔ پھر اسے کلغی
مل گئی جسے سباز میں لگاتے ہوئے بولا ”اتنی سیانی، اتنی سمجھ دار ہو کر، اب تک رات کی بات
لیے بیٹھی ہے؟“

اور پھر وہ باہر نکل گیا۔

رانو اٹھ کر دروازے تک گئی اور پیچھے سے منگل کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی
..... کوئی دیر میں گلی کے کٹڑے لپک کر منگل کو چھپا لیا۔ اب ہیر گاتے ہوئے اس کی
صرف آواز آرہی تھی ۔

ہیر آکھیا جو گیا جھوٹھ بولیں، کون ر ٹھٹھریے یار مناد اندالے

ایسا کوئی نہ ڈٹھا میں ڈھونڈ تھکی جیہذا گیاں نوں موڑ لیا وندالے

ہیر نے کہا، اے جوگی تو جھوٹ کہتا ہے، روٹھے یار کو منانے کون جانتا ہے؟..... میں
ڈھونڈتے تھک گئی، ایسا کوئی نہ دیکھا جو جانے والوں کو واپس لے آئے.....

ایک چادر مٹی

(۴)

چنوں نے پورن دئی سے بات کی۔ پورن دئی نے اپنے شوہر گیان چند سے، جو گانوکا سرخ تھا اور اس وقت کوٹے کی متازہ فیہ زمین کے ٹیلے سے کھدوا کر نیچی زمین پر مٹی ڈلاتے ہوئے راستہ ہموار کر رہا تھا۔ اس نے جو رو سے منگل کے گھر کی حالت سنی تو بولا..... ”ہاں ہاں، ٹھیک ہے..... رانی بچاری اور کہاں جائے گی؟ کیا کرے گی؟“ اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بول اٹھا..... ”مگر منگل تو رانی سے بہت چھوٹا ہے.....“

”تو کیا ہوا؟“ پورو بولی..... ”اے کون سی ہیر مل جائے گی؟..... گھر میں کھانے کو نہیں، بدن پر کپڑا نہیں۔ دونوں کا کام ہو جائے گا۔ دونوں سکھی ہو جائیں گے“ اور پھر گانوکے سرخ کو ڈرانے کے لیے وہ کچھ اور بھی اپنے شوہر کے قریب چلی آئی اور کہنے لگی ”تم نے سنا، سلاتے سے اس کا؟“

”نہیں نہیں..... نہیں تو“

”میں تو کہتی ہوں..... ان اراعیوں، ان سلسوں کو گانوکے سے نکال ہی دینا چاہیے..... یہ جہلم اور تینوں بیٹیاں اس کی جو بیایا ہوئی ہیں وہ بھی اور جو نہیں وہ بھی، سب ایسے گھومتی ہیں جیسے کتیا.....“

”تو کہے جائے گی یا مطلب کی بات بھی بتائے گی؟“ گیار چند نے بے صبری سے کہا..... اور بولا ”کچھ ہوا؟“

”ابھی تو کچھ نہیں..... ہاں ہو جائے گا۔“

گیان چند کیا امید لے کر سننے آیا تھا لیکن سب مڑا کر کراہو گیا..... وہ بولا ”کچھ ہوا تو.....“ وہی حال ہو گا اس کا جو چودھری مہربان داس کا ہوا..... لوہے کے لنگوٹ والے بابا ہری داس کا ہوا۔“

پورن دئی نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

گیان چند معنی خیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”مت یہ سمجھنا اب کے مقدمے میں صرف مرد ہی بھگتیں گے..... جب تک عورتیں برابر کا حق نہیں مانگتی تھیں، ٹھیک تھا..... اب لیں برابری کا حق“

”میں ایک بات پوچھتی ہوں“ پورن دئی نے کہا ”تم نے جہلم کو دھرم شالہ میں کیوں بلوایا ہے؟“ وہ اندر ہی اندر ہری داس کے نام کی بس گھول رہی تھی!

”دھرم شالہ میں کہاں بلوایا ہے؟..... وہ تو مہر کرم دین کے باغ میں.....“

گیان چند نے کچھ ہکلاتے، پھر فوراً ہی راستہ پاتے ہوئے کہا۔

”مسلمان ہو کر دھرم شالہ میں کیسے آسکتی ہے؟“

”اچھا..... اب دھرم شالہ کی جگہ کر مو کے باغ نے لے لی؟“

”ہرے نہیں ری سودائن..... اس نے باغ کے سب کیلے توڑ لیے۔“

”تمہارے باغ کے تو نہیں توڑے؟“

”ہاں مضبوط تھی۔“ گیان چند نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”نہیں تو وہ کیا کی کرتی؟“

”ہاں مضبوط تھی یا پہلے ہی آتے جاتوں نے توڑ لیے.....؟“

گیان چند کا چہرہ سیاہ پڑ گیا..... پور د سے نظریں بچاتے ہوئے وہ بولا۔

”اچھا اچھا..... تو بات کرنے آئی تھی منگل کی.....“

”منگل کی نہیں، رانی کی۔“ پور د نے تردید کی۔

”رانی کی سہی۔“ گیان چند بولا ”میں تو سمجھا ہوں ما سے منگل کے ساتھ چادر ڈا“

عی لیتی چاہیے..... یوں بھی گانوں میں آئی ہوئی عورت باہر کیوں جائے۔ اور اور اور
کیوں جھانکے؟..... اس میں گانوں کے ہم سب مردوں کی بدنامی ہوتی ہے.....“

اور پھر مزدوروں کی طرف منہ کرتے ہوئے گیان چند نے بلند آواز سے کہا ”کامیو
گھبر دو..... سب زمین برابر کر دو، کہیں بھی اونچ نیچ نہ رہے.....“

اور تن اور جوان کسبوس اور کدالوں سے کام میں لگ گئے..... ان کے جسموں
پر تیل لگے، کسے ہوئے پٹھے دور دور تک ہوا میں جلوتیاں مارنے، روشنی میں چمکنے لگے.....
اور گیان چند سوچتے لگا۔ ہمارے دیلش پنجاب میں جہاں عورتوں کی کمی ہے، کیوں مردوں
سے ان کا حق چھینا جائے؟ کیوں ایک عورت کو بے کار جلنے سڑنے دیا جائے؟ پھر وہ گانوں کی
پنچایت سے الگ اور حضور سنگھ کی بھائی برادری سے الگ ملنے کے لیے چلا گیا.....

منگل کی غیر حاضری میں کچھ لوگ بڑی کو دیکھنے آئے تھے۔ بڑی محسوم کچھ نہ
جانتی تھی۔ دہلی کے کہنے پر مہمانوں کی خاطر خدمت کے لیے دوڑ کر چنوں کے وہاں سے
برقی لے آئی جس میں ماوا کم تھا اور شکر زیادہ۔ نفع گیر دکانداروں نے ایک سیر ماوے سے
پانچ سیر برقی بنائی تھی اور شہر کی یہ بیماری گانوں تک چلی آئی تھی..... وہ تین آدمی تھے،
ایک ادھیڑ عمر کا، تقریباً بوڑھا..... اور باقی کے دو..... جوان..... ایک تو صاف
اس بوڑھے کا بیٹا معلوم ہوتا تھا اور دوسرا شاید اس کا دوست تھا۔ ہو سکتا تھا بھائی عی ہو لیکن شکل
باپ پر نہ گئی ہو..... دہلی کے اشارے پر وہ بڑی کو اٹھتے بیٹھتے، اندر آتے باہر جاتے دیکھ
رہے تھے۔ نگاہوں سے تول رہے تھے۔ نوجوان کی نگاہیں تو پھر اچٹ کر پڑتی تھیں لیکن بوڑھے
کی سیدھی..... اور جہاں پہنچتیں وہیں چپک جاتیں..... آخر جب بڑی نیچے گمڑے میں
سے پانی ڈالنے کے لیے بیٹھی اور پھیلی تو بوڑھے نے ہنکارتے ہوئے کہا ”ماں“

اور پھر بولا، ٹھیک ہے، سب ٹھیک ہے۔“

اسی وقت بڑی کے ماتھے پر کسی خیال کی پرچھائیں گزری اور اس سے پہلے کہ دہلی

جداں اسے باہر جانے کا اشارہ کرتی، بڑی ایک عی ز قد سے باہر بھاگ گئی اور اپنے پیچھے ایک ایسی خوشبو چھوڑ گئی جو نو خیز لڑکیوں عی کے بدن سے آتی ہے.....

ہزار روپے سے آتے آتے ساڑھے پانچ سو پر فیصلہ ہوا۔ اس پر جداں کو سوچنے کا موقع دے کر اپنی تسلی تشفی کرتے ہوئے وہ لوگ چلے گئے۔ حرافہ نے موقع بھی ایسا تلاش کیا تھا جب کہ رانو کا نو کی دوسری عورتوں کے ساتھ کپاس چننے گئی تھی۔ جداں اب سوچ رہی تھی..... یہ رقم ان لوگوں سے لے گی کیسے؟ لڑکی انھیں دے گی کیسے؟..... رانو سے تو پوچھنا ہی پڑے گا لیکن اسے تو وہ اپنے دل سے اپنے گھر سے ہمیشہ کے لیے بیگانہ کر چکی تھی۔

رانی لوٹی تو جداں اس سے لپو پوتیاں کرنے لگی اور جب اسے پاس بٹھا کر، جداں نے اس کی بغل میں اپنی بوڑھی..... تھریوں ماری بانہ ڈالتے ہوئے کہا..... ”تو جہنم جہنا تر کی بہو میری“ تو رانو کا ماتھا ٹھنکا۔ جب عی بڑی نے باہر سے آتے ہوئے ماں کو اندر آنے کا اشارہ کیا جسے جداں کی تقریباً اندھی آنکھیں نہ دیکھ سکیں۔ رانو اٹھ کر اندر گئی تو بڑی نے اپنی ٹھیٹ زبان میں ماں سے سب کہہ دیا۔ ساڑھے پانچ سو کی بات بھی سنا دی..... وہ دروازے کے پیچھے سے سب سختی رہی تھی۔

رانو، بڑی کے منع کرنے پر بھی لپک کر باہر چلی آئی۔ وہ اپنی اوقات، اپنی ہمت، اس گھر میں اپنا درجہ سب کچھ بھول چکی تھی۔ وہ اس کڑک مرغی کی طرح تھی جو اپنے انڈے بچوں کو بچانے کے لیے شکرے اور باز پر بھی جھپٹ پڑتی ہے۔ ”آج کون آیا تھا یہاں؟..... کس کی ہمت پڑی یہ دہلیز پھاٹنے کی؟ میری بیٹی کا سودا کرنے کی.....؟“

جداں ایک ”عورت“ قسم کی مدافعت پر اتر آئی..... نہیں دیکھ رہے وہ تو

ایسے ہی بات کر رہے تھے۔ اب ہر کسی کا منہ تھوڑا پکڑا جاسکتا ہے؟“

”ہاں پکڑا جاسکتا ہے، جھلسا جاسکتا ہے۔“ رانو کوئی سن تھوڑے ہی رہی تھی۔ ان

حرام جاؤں کی جہان کاٹ دینا تھی۔ منہ میں لٹ لٹ کرتا ہوا اٹھونس دینا تھا..... میری بیٹی جس کی ایک ایک ہانہ، ایک ایک انگلی، ایک ایک پور لاکھ لاکھ کی، اس کی ایک ایک کٹی میں سو سو کھانیں تھیں۔ لوگوں کی ایک ایک نجر میں عمر قید.....“

”میری بیٹی ہے۔“ جہاں بولی ”میری بھی تو کچھ ہوتی ہے، میری بھی تو پوتی ہے۔“

”پوتی بہو سے ہوتی ہے، جب بہو ہی نہیں، تو پھر پوتی کیسی؟“

اور پھر ایک لمبی سی، گھسٹی ہوئی ”کھردار“ کہتے ہاتھ لپکاتے ہوئے رانا اندر چلی

گئی آخر..... وہی جھلنگا، وہی رونا..... ہائے اب میں بیٹی کو بکتے دیکھوں گی؟ میں تو

صرف کچھ لے کے نہیں آئی تھی تو یہ درد شاہوئی..... یہ تو بک جائے گی!.....“ اور وہ

بات بات پہ اس کی ہڈیاں توڑیں گے، نوج نوج کے کھائیں گے، کہیں گے تجھے ایسے ہی تو

نہیں خرید کے لائے ہیں، ہوام دیے ہیں..... لگو کے مرحوم کے زمانے میں آخری یہی

حرہ تھارانی کا.....“ ”دیا تو نہیں دیا..... لیا تو کچھ نہیں؟ بیاہ کر لائے ہو کمرید کے تو

نہیں لائے؟“..... اور یہ بیٹی میری بک جائے گی..... گھر میں کھانے کو کچھ نہیں۔

بیاہ ہو گا بھی تو کیسے۔ ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا..... آج مہربان داس چودھری

ہوتا، ایک ہی رات میں بیٹی کا جہنم تیار کر لیتی اور پھر اسے اپنے سامنے طوطیاں بجاتی، اچتی،

گاتی ہوئی برات، سہرے باندھے ہوئے لڑکے کے حوالے کر دیتی اور جب ڈولی اٹھتی تو

دور کھڑی دیکھتی، روتی، دیکھتی..... لیکن کبھی نہ کہتی..... ”بیٹی! تیرے سہاگ کے لیے

رات ایک ماں نے اپنا سہاگ لٹا دیا.....“

پھر..... پانچ ساڑھے پانچ سو ملیں گے تو یہ پچا پچاں مجھے کچھ دے گی تھوڑے

ہی.....؟ آخر..... پچا پچاں ہے تو ایک ہی بار ساڑھے پانچ سو میں کیوں، کیوں نہ میں

اسے لے کر شہر نکل جاؤں اور تھوڑا تھوڑا کر کے بچوں؟ لاہور میں سیکڑوں ہزاروں بابو

لوگ پھرتے ہیں جو کچھ دیر کے دل بہلاوے کے لیے پندرہ پندرہ بیس بیس روپے دے جاتے ہیں۔ کھانے کو چنگی چو کھی ملے گی، پہننے کو ریشم کھین کھین کھاسا..... تھوڑے ہی دنوں میں روپوں اور کپڑوں سے صندوق بھر جائیں گے.....

جب ہی زنائے کے ایک تھپڑ کی آواز سنائی دی جو رانوں نے خود ہی اپنے منہ پر مار لیا تھا..... اور اب ہمیشہ کی طرح ایک انجانے خوف سے کانپنے لگی تھی۔

”جداں رانوں کا آخری فقرہ سوچ رہی تھی..... ”پوتی بہو سے ہوتی ہے جب بہو ہی نہیں تو پوتی کیسی؟“ اسی وقت گیان چند، کیسر سنگھ، جگو، دلا، کرم دین اور گانوں کے دوسرے آدمی چلے آئے اور آکر حضور سنگھ کے پاس بیٹھ گئے۔ جداں کو بھی بلوالیا اور رانی کے چادر ڈالنے کی بات یوں چھیڑ دی جیسے یہ بھی کوئی جھگڑا ہے جس کا فیصلہ پنچایت کو کرنا چاہیے۔ چادر کی رسم کی بات شروع ہو گئی۔ حضور سنگھ نے سمجھا..... اس عمر میں جبکہ وہ مرنے کے قریب ہے، پنچایت، برادری کے لوگ اس کی بے عزتی کرنے، اسے آخری ٹھوکر مارنے آئے ہیں لیکن جداں عورت کی سریع العقلمی سے یکایک بات کی تہہ تک پہنچ گئی بلکہ اس سے بھی کہیں دور آگے، بہت آگے نکل گئی۔ ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا..... اتنا نزدیک، اتنے قریب کا خیال اسے پہلے کیوں نہ آیا؟ پھر اسے یاد آیا ہاں، ہاں! آیا تھا لیکن جب بڑی کتنی چھوٹی تھی۔ اب رانوں پھر اس کی بہو ہو سکتی ہے اور بڑی اس کی پوتی..... اور..... جب حضور سنگھ نے بچوں کی طرف دیکھ کر آنکھیں پھڑپھڑائیں تو بوڑھی دانت نکال کر اس کی طرف بڑھی۔ ڈبو کی بوڑھی مری تھوڑی تھی؟..... وہ تو زندہ تھی..... جداں..... جداں بولی ”تو بچ میں مت بولا کر، بڑھے! نہ مرے نہ جان چھوڑے..... جانتا بھی ہے کیا کیا انصاف ہو رہے ہیں اس دنیا میں؟..... کہ اس جہنم کا اندھا تو اگلے جہنم کا بھی اندھا.....“

بچ موجود تھے جنہوں نے بڑھے بڑھی کا بھی فیصلہ کرادیا اور آخر حضور سنگھ اور جنداں دونوں کی منظوری لے کر چلنے لگے۔ ان کے جانے سے پہلے بزرگ ہونے کے ناتے جنداں نے سب کو آئیر وادی..... ان سب کے پیٹھ موڑنے کی دیر تھی کہ رانی بھری بھری ہوئی منظر پہ چلی آئی..... ”تو تو بڑی کے بیاہ کی بات کرنے جا رہی تھی، پھا پھاں بیچ میں میرا مردہ کیوں نکال بیٹھی؟“..... اور وہ بکے جا رہی تھی..... ”شرم ہے تو کچھ کھامر..... گھر میں بیسیوں ہولڈ لیاں پڑی ہیں وافر..... ہے دیوی ماں! یہ جو ہڑ کے گد لے پانی میں ڈوب ڈوب مرے۔ اوپر سے آٹے والی مشین کو کو کرے..... تو میرے چھوس سے کیوں نہیں کر لیتی؟ بنتے کے ہاں کیس نہیں بیٹھ جاتی؟ سنتے پہ کیوں نہیں چادر ڈال لیتی؟ میں اس سے بیاہ کرنے جاؤں گی جسے میں نے چھاتی نکال نکال کر.....“

جب ہی کوئی ہاتھ رانی کے بالوں پر پڑا اور وہ الٹی ہوئی دیوار کے پیچھے کوڑے کے ڈھیر پر جا گری۔ اٹھی، نظریں صاف ہوئیں تو سامنے چنوں کھڑی تھی اور دانت پیس رہی تھی..... رنڈی، کھسم کھاسی، ایدھر مر..... اور پھر اسے مکان کے پیچھے کھولے میں، جہاں گانوں کے لڑکے لڑکیاں رات کے اندھیرے میں ملا کرتے تھے اور یا چور سیندھ لگاتے تھے، لے جاتے ہوئے بولی..... ”ہم تیرے بھلے کی کریں کیسے!..... اور تو پھیلتی جائے؟

”نہیں چنوں، نہیں“ رانو نے اس کے سامنے دکھڑا روتے پانوں پکڑتے ہوئے کہا

”وہ بچہ ہے..... میں نے کبھی اسے ان نجروں سے نہیں دیکھا“

چنوں بولی دیکھ..... تجھے اس دنیا میں رہنا ہے کہ نہیں رہنا؟ اس پیٹ کا ترک

بھرنا ہے کہ نہیں بھرنا؟ اس اپنی شرم کو ڈھانپنا ہے کہ نہیں ڈھانپنا؟ بڑی آئی ہے نجروں

والی..... کہا نہیں بھٹے شاہ نے؟

بٹھیا رب داکیمہ پاتا

ایہ مردوں پلٹنا اودھر لانا

بس اودھر سے نکال کر اودھر ڈال دینے کی بات ہے..... پہلے اسے ان

نجدوں سے نہیں دیکھا تو اب دیکھ کر دیے

رانو اپنے تصور میں منگل کو دیکھ رہی تھی!

چنوں بولتی چلی گئی..... سوچ تو مویئے! دو شادیاں یہاں کس ماں جانی کو ملتی

ہیں کرنے کو؟ جس کے ساتھ ہو گئی سو ہو گئی۔ بیچ میں دو چار ہو جاتے ہیں لیکن وہ کوئی اچھی

بات ہے؟ ہر بکلت ڈر سے جان نکلی رہے..... ہاں! مردوں کی بات الگ ہے..... یہ

دنیا ان کی..... کوئی پوچھتا بھی ہے؟ کوئی جو باہر سے آ کر تیرے منگل سے کرے گی

تو کیوں نہ کرے؟..... سلامتی کی سنی ہے نا تو نے؟..... کھیر، وہ سب باتیں چھوڑ تجھے

اپنی بیٹی کا بیاہ بھی کرنا ہے کہ نہیں کرنا؟.....“

رانو پھر چونک گئی..... اپنا بیاہ کہ بیٹی کا؟..... اپنا..... وہ بچوں کی طرح

نہ نہ کی ضد کرتے چلی گئی اور گھر پہنچ کر دن بھر بیٹھی سوچتی رہی، سوچتی رہی جب ہی ایک

اور ہی آگ اس میں لپک آئی جس کا تعلق بڑی سے تھانہ چھوٹے دو بچوں سے.....

اور نہ چھوٹے سے..... کوئی اور ہی ناپید بچے اس کے پیٹ میں مچلنے لگے تھے۔

شام کے قریب پورہ آئی تو رانو بیمار پڑی تھی۔ ایک پٹی سی سر کے گرد کس کر باندھ

رکھی تھی۔ بڑی چنوں موسی کے یہاں سے جا کر آٹے کی چڑیاں سی بنوا کر لے آئی تھی اور

رانو نے انھیں اپنی کنپٹیوں پر چپکار کھا تھا اور وہ چڑیاں دلنہ دلنہ کر کے رانو کی ساری گرمیاں

چن رہی تھیں۔ پورن دئی نے تھوڑی مزاج پر سی کی اور پھر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کیوں نی

..... کیسا بکھار ہے؟ اور رانو منہ موڑ کر مسکرا دی۔

اس پر پوری کائنات ایک مخدوش سے طریقے پر کھل اٹھی۔ پورہ ہنسی۔ بڑی کچھ نہ

جانتے ہوئے بھی ہنسی کے اس اکاد کا موقع سے قائدہ اٹھا کر کھلکھلا اٹھی..... نہ معلوم کب اور کیسے سنتوں، مہاتماؤں، رادھے کرشن اور شیو پاروتی کی تصویریں اپنے آپ چو کھٹوں میں جا بکی تھیں اور ان دیوی دیوتاؤں کے چہروں پر دنیا بھر کی محبت کا نقش دوام ہو گیا تھا۔ بڑی کی کھلتی سے بکائن پہ آئے ہوئے توتے چہچہاتے ہوئے اڑ گئے۔ مندر کے سنہری کلسوں پر سورج نے اپنا آخری گلال کھنڈ دیا..... اور گھنٹیاں بجتے لگیں.....

ایک دم..... ایک دم کہیں سے منگل آ کر دروازے میں کھڑا ہو گیا وہ خوش تھا بہت خوش۔ آج اس نے سات روپے کمائے تھے جو اس نے معمول کی طرح آتے ہی رانو کے ہاتھ میں تھما دیے اور پورن دئی بول اٹھی ”لے۔ یہ پہلی کمائی، وہ کمائے تو کھا۔ اور رانی نے گھبرا کر پیسے ہاتھ سے چھوڑ دیے۔ نوٹ بھنڈارے کی طرف اڑنے لگا اور سکے کچے فرش پر گر کر کوئے کھدرے تلاش کرنے لگے۔ منگل نے پیران ہوتے ہوئے کہا ”ہنس کیوں رہی ہو، چاچی؟“

چاچی بولی..... ”یہ تو اپنی اس سے پوچھ“ اور پھر اسے گھبرائی ہوئی رانی کے پاس اکیلے میں چھوڑ کر، بڑی کو باہر کھینچتی ہوئی پورن دئی چل دی۔ منگل، پیچھے، بیوقوفوں کی ایک مخصوص، پر خلوص ہنسی ہنسا اور کہنے لگا ”کوٹلے کی سب عورتیں اس قابل ہیں کہ.....“

رانو نے سچ ہی میں بات کاٹ دی ”مرد کم ہیں؟“

منگل کچھ نہ سمجھا..... دونوں اپنے اپنے جال اور اس کی گھنڈیوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ منگل نے اپنی ٹرنگی میں سے کرتی اٹھائی جو کبھی بھلے زمانے میں اس نے پشاور سے منگوائی تھی جس کے گجے پر ادن کا کشیدہ تھا اور لوکاٹھ کے پھول سے بنے تھے۔ اسے ہا تھ میں لے کر، لہراتا ہوا وہ باہر نکلنے لگا..... کہتے ہوئے..... ”کم سے کم مردوں کی بات سمجھ میں تو آتی ہے.....“

”مردوں کی مردوں کو سمجھ میں آتی ہے“ رانو بولی ”اور عورتوں کی عورتوں کو“ اور پھر اس نے آنکھیں منکائیں، جو فن اسے لاکھوں کروڑوں صدیوں سے آتا تھا، منگل نے جی ہی جی میں سوچا..... رانی ٹھیک کہتی ہے کیا اسے معلوم تھا، آج ڈھارے کے گھپ اندھیارے میں جہاں چودھری کے مکان کا ملہ پڑا ہے، شہتیر کے پیچھے میں اور سلاستے ایک نئی ہی عمارت کی نور کہ رہے ہوں گے؟ اس نے دروازے میں سے مڑ کر رانی سے کہا ”یہ تو آج کیا مرد عورت کا جھگڑالے بیٹھی ہے؟“

”وہی تو جھگڑا ہے سارا؟“

”کر کھیترا کی لڑائی ہے؟“

”اس سے بھی پرانی۔“ رانی نے جواب دیا اور پاس آتے ہوئے بولی ”جس میں جیتا

ہوا بھی ہار اور ہار ہوا بھی ہارا۔“

منگل رک گیا اور رانی کی بات کا کوئی گہرا مطلب سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں کچھ نہ جانتے تھے لیکن وہ سماں تھا جب کوئی بھی بات کر دے تو مطلب بن جاتا ہے اور کبھی کچھ بھی کہو مطلب نہیں بنتا۔ اس وقت مطلب تھا یا نہیں اس کے لیے دماغ چاہیے تھا یا وقت، اور دونوں کے پاس یہ دونوں چیزیں نہ تھیں..... رانو تینتیس چونتیس برس کی بھرپور عورت تھی جس میں نسائیت انگڑائی لے کر جاگی تھی۔ اس میں نو عمر نو خیز لڑکی جیسی رعونت تو نہ ہو سکتی تھی۔ البتہ عورت بننے کا پورا غرور تھا جو برسوں، صدیوں سے حالات کے رڈے در رڈے کے نیچے دب کر رہ گیا تھا اور اس وقت ابل کر اچھل کر نکلا جب اوپر کی سطحیں کمزور ہو کر راستہ چھوڑ دیتیں..... یہ خلاف اس کے منگل، چوبیس پچیس برس کا جوان، گہرو، شروع ہی سے دریا اور آخر دریا، جو منبع کا محتاج تھا نہ دہانے کا اور نہ کناروں کا۔

باہر آکر رانوں نے یوں ہی برتن ٹکرائے شروع کر دیے جو وہ چاہتی تھی وہی ہوا۔ منگل سلاستے کے پاس جانے سے رہ گیا۔ ماں جنداں نے بیٹے کو آواز دی اور جب وہ پاس آیا تو اسے ہٹا کر ہاتھیں کرنے لگی۔ رانی مصلحتاً شک گئی۔ بڑی کو اور جڑواں بچوں کو کھیلنے کے لیے باہر بھیج دیا گیا۔ رانی جا کر دروازے کے پیچھے کھڑی ہو گئی جو ہماری دنیا کی اکثر عورتوں کی جگہ ہے۔

جنداں نے ابھی بات چلائی ہی تھی کہ منگل سمجھ گیا۔ پکڑی میں سے اس کے بال چبھے اپنے آپ باہر آنے لگے اور وہ انھیں ایک ہاتھ سے اٹھا، دوسرے ہاتھ کی انگلی سے اندر کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ویسے کی مٹ میلی روشنی میں اس کا چہرہ خون کے ایکائی دورے سے لال ہوتا ہوا دکھائی دینے لگا.....

رانی نے کواڑ کے پیچھے ٹھپ کر، دیوار کا سہارا لیتے ہوئے، دل پر ہاتھ رکھ دیا منہ سے جس کی دگر دگر سنائی دے رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کوئی خونی، اوپر کی منزل پر کسی کا خون کر کے اب بھاگنے کے لیے جلدی جلدی سیڑھیاں اتر رہا ہے۔ کوئی دیکھتا وہ کیسے ایک دم تو ریے کے بے بہارے پھول کی طرح پھلی، کھلائی اور مرجھائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ دیوان شاہ کی دکان پر بکنے والے پرانے چھوہاروں کی طرح سکر چکے تھے اور گھٹنے آپس میں ٹکرا رہے تھے جیسے محبت یا خوف کے یک بارگی جملے سے لہزے ٹکراتے ہیں.....

منگل نے اٹھ کر اندر کی طرف دیکھا جہاں اس کے قیاس کے مطابق رانی گئی تھی..... "نہیں یہ نہیں ہوگا، یہ کبھی نہیں ہوگا۔" اس نے بائیں ہاتھ کو ایک فیصلہ کن جھٹکا دیتے ہوئے کہا "جیسے وہ چھانٹے کو دیا کرتا تھا جب گھوڑی، بکی کو ڈکلی میں ڈالتا ہو۔ پھر وہ بولا "میں ماں کی گالی نہیں کھاتا..... ان بچوں کی ماں کا..... یہ تو کیا لاث ارون جارح پیغم بھی آجائے تو میں یہ کبھی نہ کروں۔ میری ماں کے برابر اس کی عمر ہے..... میں سر

اس کے پانو پر رکھ سکتا ہوں، پانو سر پر نہیں.....“

اور وہ بکتا جھکتا، ادھر ادھر تہرے سناٹا، ہوا کو گالیاں دیتا، ہوا باہر نکل گیا اور منڈیر پر ایک سایہ سالہر لیا اور پھر پیچھے ہٹ گیا..... ”ہائے نی! نی..... نی.....“ جنداں نے چلاتے ہوئے کہا..... ”رہے! انھی!..... دیکھ کہیں اپنے آپ کو کچھ کر ہی نہ لے..... کہہ کے گیا ہے، گھر میں ایک اور تلو کے کی لاش آئے گی.....“

رانو لپکی، گری، پھر لپکی حتیٰ کہ..... دروازہ کے پاس جا پہنچی جہاں جنوں پورن دئی، ودیا وغیرہ نے اسے جکڑ لیا۔

رانی اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے بولی ”ہائے نی، ہائے نی.....“ اور اس نے اندھیرے کی طرف اشارہ کیا۔

”کچھ نہیں کرے گا۔“ جنوں نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”ہائے! کچھ کر لیا اس نے تو میں مر جاؤں گی..... ہم سب مر جائیں گے سب کا ٹھیکرا مجھی پہ ٹوٹے گا۔“

”تو مر رہا۔“ ودیا نے آگے بڑھتے ہوئے کہا ”ٹھیکرا توڑنے والی اور کون ہیں، ہم ہی ہیں نا؟“

”ہے دیوی ماں..... میرا تو سارا بدن ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ رانو اپنے تشنجی ہاتھ چھاتی پر رکھتی اور پھر پورو کا سہارا لیتے ہوئے بولی۔

جنوں رانی کے ہاتھ دباتے، اسے ہوش میں لاتے ہوئے بولی ”تجھے ہی تو گرم کرنے کے لیے یہ ساری مصیبت کی ہے..... کیا برف ہوئی جا رہی تھی۔“

”مجھے بچالو چاچی!“ رانی نے پورن دئی کے پیر پکڑتے ہوئے کہا۔

پورن نے اپنے پیر چھڑا لیے اور بولی ”مری کیوں جا رہی ہے؟.....“ کچھ ہونے

ہوانے والا نہیں۔ ان موئے مردوں پر جب لادی ڈالی جاتی ہے سب ایسا ہی کرتے ہیں۔ ہم عورتیں یہ نہ کریں تو سب کی سب دھری رہ جائیں..... تو تو جانتی ہے

رانو کو کچھ حوصلہ ہو گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا اور بدستور لرزتی کانپتی ہوئی چنوں کی طرف دیکھ کر بولی ”وہ کیا کرے گا؟“

”جو تو نے کیا“ چنوں نے کہا۔

”کیا سوچے گا؟“

”جو تو نے سوچا.....“

بڑی پاس کھڑی سن رہی تھی اور اب تک معاملے کو کچھ سمجھ چکی تھی۔ وہ ایک دم بولی..... ”ماں نے یہ سب کیا تو میں کچھ کھا مروں گی۔“

اس پر سب عورتوں نے اپنی اپنی ناک پر انگلی دھرتے ہوئے ایک لمبی کھسکتی ہوئی ”ہو، ہائے.....“ کی اور پھر چنوں نے بڑھ کر بڑی کی چوٹی کھینچ ڈالی اور باقیوں نے دھکتے دے کر اسے اندر بھیج دیا..... بڑی جب اندر گئی تو شرر نفرت اور کدورت سے اس کا چہرہ سوج رہا تھا.....

ایک چادر مٹی کی

(۵)

منگل ڈھارے میں پہنچا۔ سلامتی کوٹھے کوٹھے ہوتی ہوئی منگل کے گھر جا کر جھگڑا ہوتے سن آئی تھی جو اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔ اب وہ لوٹ کر منگل کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے دماغ میں ایک ”بولی“ تھی جسے وہ منگل کو سنانا چاہتی تھی۔

ہمدی نے چند منگ لے یا رھڈ گیا گلی دا آنا

ہنسی ہنسی میں جھومر کیا مانگ لیا کہ یار نے گلی ہی میں آنا چھوڑ دیا!

جب ہی سامنے منگل دکھائی دیا..... وہ غصے سے ہانپ رہا تھا۔ ایک پل ٹھہکنے کے بعد وہ آکر سلامتی سے کچھ دور کھڑا ہو گیا۔ سلامتی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آئی اور منگل کی خاموشی میں ہزار مطلب تلاش کرنے لگی۔ اور پھر ہزار مطلب میں ایک ہی مطلب..... وہ آج بن ٹھن کے آئی تھی اپنی بڑی، بیابھی ہوئی بہن عنایتی کا دوپٹہ اڑالائی تھی جس پر مقیش لگی تھی جو کہیں دور سے آتی ہوئی روشنی میں چمک چمک جاتا تھا۔ شام کی ہلکی ہلکی ہوا میں سلامتی کے بدن پر لپٹا ہوا دوپٹہ یوں کانپ رہا تھا جیسے پیٹھے کی مٹھائی پر لگا چاندی کا ورق کانپتا ہے۔

منگل کی آنکھیں، اندھیرے کے باوجود ایک مشعل کی طرح جلتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ سلامتی کے پاس پہنچ کر اس نے اپنا پانوٹے کے پاس پڑے ایک شہتیر پر رکھ دیا جس کا بہت سادہ لوگ کاٹ کر جلانے کے لیے لے جا چکے تھے۔ آہستہ مگر مضبوط آواز میں منگل پکارا..... ”سلاھیے!“

”ہوں!“ سلامتی ایک بیٹھی سی آواز میں بولی۔

”اُدھر آ“ وہ بولا اور سلامتی جواب دیے بغیر منگل کے پاس آگئی، رک گئی.....
”اتار دے دوپٹہ“ منگل بولا۔

سلامتی نے دوپٹہ الگ پھینک دیا۔
”نکال دے قمیص۔“

سلامتی نے قمیص اتار دی..... ایک لڑکی کے لیے سب سے مشکل بات لیکن اس لمحے کی سولی پہ لٹکی ہوئی تھی اپنا ارادہ ہی کھو بیٹھی تھی۔ دلیاں ہاتھ بائیں اور بایاں ہاتھ دائیں شانے پر رکھے وہ تھوڑا جھک گئی۔

شاید وہ کچھ کہتی لیکن منگل نے اندھیرے میں، کہیں دور سے، اپنا آپ چھڑا کر آتی ہوئی دیے کی لو میں سلامتی کی طرف دیکھا اور اسی وزنی آواز میں بولا..... ”ہو گئی سیر..... اب چلی جا.....“

سلامتی نے بھونچکی ہو کر اپنے کپڑے اٹھائے۔ جلدی جلدی قمیص گلے میں ڈالی اور پھر گھبراہٹ اور دہشت کے عالم میں آگے دیکھتی، پیچھے مڑتی ہوئی چل دی۔

اسی وقت کوئی پاس سے گزرا اور جیسے خاموشی کا منہ پائنے کے لیے بول اٹھا ”کون ہے لوئے؟“ منگل نے ایک دم تاؤ میں آکر نتھنے پھلا لیے اور بولا ”تو کون ایس اوئے مامیا؟“ اور وہ آدمی لمحے بھر کے لیے ٹھٹک کر اپنی راہ پہ ہولیا..... وہ مقتول نہ تھا!

منگل کچھ دیر وہیں کھڑا گرد گرد کی فضا کو سونگھتا رہا اور پھر ایک انکی بائیں ہاتھ کو چھانٹا لگانے کے انداز میں جھٹک کر، سلامتی کے گھر کی طرف، ساہنسیوں کی ٹھٹھی میں کہیں غائب ہو گیا..... ساہنسیوں کی ٹھٹھی جو ہمیشہ گانو کے ایک طرف ہوتی ہے جہاں رائیں چھنیے، چمڑ، مصنتی وغیرہ رہتے ہیں اور جس کی طرف گانو کی گندی موریوں اور بدروؤں کا نکاس ہوتا ہے۔

ایک چادر میلی

(۶)

بچوں کی مقرر کی ہوئی تاریخ آہنچی۔ پورو، چنوں اور وڈیانے مل کر رانو کے ہاتھوں پر منہدی لگادی اور کنگھی کر کے اس کی مینڈھیاں گوندھ ڈالیں اور سر پر خوبصورت سا ڈاک بنگلہ، بنا دیا۔۔۔۔۔ اتنا دلا سادیے جانے کے باوجود رانو کانپ رہی تھی، رورہی تھی۔۔۔۔۔ بچے نا کبھی کے عالم میں چپ تھے اور سوچ رہے تھے۔۔۔۔۔ آج ان کی ماں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ بڑی ان کے گلے میں اپنی لانی لانی بانہیں ڈالتی ہوئی، چپ کرانے کے بہانے انہیں رلا رہی تھی اور پھر۔۔۔۔۔ جیسا کہ بند دبست کیا گیا تھا سب بچوں کو چنوں موسی کے گھر بھیج دیا گیا۔

آنگن میں پھنسی کی میلی سی چادر تنی تھی جس کے نیچے کچھ گھڑے رکھے تھے۔۔۔۔۔ ایک طرف پرانی سی کائی ماری ٹھلیا پڑی تھی اور ان سب پر سیندور چھل رہا تھا۔ رانو کو لا کر جب چادر کے نیچے بٹھایا گیا تو اس نے ایک دلدوز چیخ ماری۔

..... مرنے والے! آدیکھ، کیا ہو رہا ہے تیری رانی کے ساتھ۔۔۔۔۔

روہت نے کہا۔۔۔۔۔ ”لڑکا کہاں ہے؟“

پنڈت گیان چند، کیسر سنگھ اور دوسرے لوگوں نے اُدھر اُدھر دیکھا۔ وہ تو اسے زبردستی پکڑ کر لائے تھے اور چارپائی کے ساتھ باندھ دیا تھا۔۔۔۔۔ مہر کر م دین جو اس رسم و رواج سے ذرا پرے ہٹ کر بیٹھا تھا بڑھوٹا ہوا اندر گیا اور انہی پیروں لوٹتے ہوئے بولا ”منگو تو اندر نہیں ہے!“

اس دن اتر سے آنے والی ہوا، طائبوں کی مدد سے ایک طرف بکائن اور دوسری طرف روشن دان کی سلاخوں سے بندھی ہوئی چادر کو پھڑپھڑا رہی تھی، مفت کی دف بجار ہی تھی۔ چادر کے نیچے رستیوں کے ساتھ ساتھ بندھی ہوئی کاٹھ کی چڑیاں لہراتی ہوئی چوں چوں کرنے لگیں۔ کچھ دور تنور کے پاس اس کی بھٹھل میں لیٹے ہوئے ڈبوتے اپنی ٹانگوں میں دبائی ہوئی گردن اٹھائی اور مشکوک انداز میں اس پورے منظر کو دیکھنے لگا۔ وہ اب تک بوڑھا اور نحیف ہو چکا تھا۔ نہ زیادہ روشنی برداشت کر سکتا تھا اور نہ شور۔ وہ گانو کے مرد عورتوں کی بے طور حرکتیں دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور اندازے ہی کے ساتھ دشمن پہ بھوں بھوں کرنے لگا۔

”میں تو جانتا ہوں، وہ نطقہ.....“ حضور سنگھ نے کہا شروع کیا۔

”ڈر..... ڈر.....“ جتداں حضور سنگھ کو پھٹکارتے ہوئے بولی ”سوائے بکتے رہنے کے اور کوئی کام ہی نہیں۔“ اور وہ اپنی مردہ بے تور آنکھوں سے اس جھگڑے کی طرف دیکھنے اور سنسنے لگی۔ وہ نہ جانتی تھی اب آسمان سے اگلی کون سی بلا نازل ہونے والی ہے؟ چونکہ اس کی آنکھیں دھندلی تھیں اس لیے اپنے مقتول بیٹے کی شکل اور بھی کھل کر اس کے سامنے آ رہی تھی۔

”ٹھہراوے باہمتا!“ نمبردار تارا سنگھ نے پروہت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا

”میں لاتا ہوں اس ماں کے یار کو پکڑ کے۔“

”ہاں!“ کیسر سنگھ نے حامی بھری..... ”اس کی میں بہن کے بیاہ میں جوتے

کھاتا پھروں۔“

”ہم سب چلتے ہیں؟“ جکو بھی تیار ہو گیا۔

دیوانا بولا..... ”اتنے جوتے پڑے اس پر بھی بھاگ گیا!“

گونا گونا بولے اے ”ٹھک کرنے“ سیدھے راستے پر لانے“ کے سلیکھیں

کے لوگ اس سے ”ٹیزھے“ ہو چکے تھے۔ وہ تو چاہتے تھے اس کی ایک آدھ ٹانگ ہی توڑ دی جائے تاکہ چادر کے نیچے آکر بیٹھے تو پھر مل ہی نہ سکے۔ چھ سات آدمی ہاتھ میں لٹھیں اور گنڈا سے لیے ہوئے باہر لپکے اور گیان چند سر بیچ، قانون کا سرسری محافظ، صرف دکھاوے کے لیے منع کرتا، شور مچاتا ہوا سب سے پیچھے..... وہاں صرف عورتیں ہی رہ گئیں جن میں سر مادائی بھی تھی جو منگل کو اس دنیا میں لائی تھی۔

مردوں کو یوں نکلتے دیکھ کر رانو داویلا کرنے لگی..... ”چھوڑ دو..... ہانی! مجھے چھوڑ دو، میں نہیں بچوں گی۔“ اور یہ سب ٹھیک ہی معلوم ہو رہا تھا۔ رانو پیچھے کی طرف گری اور بیہوش ہو گئی۔ عورتیں اسی شادی کے لیے رکھے ہوئے گھروں میں سے پانی انڈیل انڈیل کر رانو کے منہ پر چھینٹے دیتے، اسے ہوش میں لانے لگیں۔ گویا وہ کہہ رہی تھیں، اس نے موت دیکھی ہے تو اب شادی بھی دیکھے.....

منگل کو لوگوں نے فارم کی ساتویں کپاس میں جا پکڑا۔ وہ پہلے ہی بہت سی مار کھا چکنے کے بعد نڈھال ہو چکا تھا۔ اب دہشت سے اور بھی نیم جان ہو گیا۔ وہ چاہتا تو اکالے کر ہمیشہ کی طرح ستر لہیا ستو کی طرف نکل جاتا لیکن شوئی قسمت ”اس مرزے کی بکی کو بھی استہزا کی صاحبان نے“ ڈھنگ دیا تھا۔ بکی اپنی بندھی ہوئی اکاڑی کے ساتھ کچھ فاصلے پر کھڑی ہری ہری چڑی اور موٹھ کھار ہی تھی اور موقع پڑنے پر ساتھ والے کھیت میں لہلہاتی ہوئی گوار کو بھی منہ مار لیتی۔ گانودالوں نے ممکنات کا خیال رکھتے ہوئے بکی کے پانو میں لوہے کا یہ بڑا موٹا سا سنگل ڈال دیا تھا اور اس پر علی گڑھ کا تالا..... اور اب وہ بے فکر ہو چکے تھے۔

منگل کا خیال تھا اس کے یار غار..... نواب، اسماعیل، اور گورداس وغیرہ اسے اس سانچے سے بچائیں گے لیکن اسے کیا معلوم کہ وہ بے غیرت بھی کوٹلے کے باقی لوگوں کے ساتھ مل جائیں گے اور بار بار یہی کہیں گے..... ”آخر عورت ہی کی بات ہے نامیار! کوئی

منگل جہاں چھپا تھا وہاں سے دوہاتھ دور خانقاہ والا کتواں تھا جہاں آج سے چند ہی برس پہلے منگل کے بڑے بھائی نکو کے قتل ہوا تھا۔ جب شام کے وقت سے سے پہلے ہی گھپ اندھیرا ہو گیا تھا اور ایک دن پہلے سورج نے زمین کی بکائن پر خون کے چھینٹے پھینک دیے تھے..... اس مٹی سے اب بھی خون کی بو آرہی تھی.....

منگل کپاس کے بغل میں ایک تنگ و تاریک ”گڑھ“ میں بیٹھا شک اور دوسو سے میں بٹا، پھٹی پھٹی آنکھوں سے باہر دیکھ رہا تھا جب گانوں کے لوگ پہنچ گئے..... سردیوں کے موسم میں کبھی کبھی، کوئلے گانوں میں کوئی بھیڑیا جنگلی سور آ نکلتا تھا اور لوگ اسی طرح لاثھیاں اور ٹھریاں، ٹوکے اور گنڈا سے لے کر اسے گھیرنے، مارنے کے لیے نکل جاتے تھے..... اور آخر اسی وقت دم لیتے جب گھرے ہوئے جانور کے پرچے اڑ جاتے۔

لوگ آکر سامنے کھڑے ہو گئے۔ منگل کو ٹھری میں دوہاتھوں کے بل جھکا دہشت کے عالم میں سب کو دیکھتا ہوا، سچ مچ ایک جنگلی سور معلوم ہو رہا تھا۔ وہ نہتا تھا اور باقی سب کے سب مسلح۔ کہاں تو لوگوں نے شور سے آسمان سر پر اٹھار کھا تھا اور کہاں وہ اب آکر سامنے کھڑے ایکا ایکی چپ ہو گئے تھے، ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے گھور رہے تھے..... دیکھیں پہلا وار کون کرتا ہے؟ شکار کس طرف لپکتا ہے؟.....

منگل کا زخروہ کاپنے لگا اور لوگوں کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد منگل نے ذرا سی جنبش کی۔ لوگوں نے ایک دم خائف ہو کر خالی زمین ہی پہ لاثھیاں برسائی اور ٹوکے چلانے شروع کر دیے..... ایک شدید ڈرنے ان میں ایسا جوش، ایسی طاقت بھردی کہ زمین میں بڑے بڑے شکاف ہو گئے۔

ایک بار پھر وہ ایکا ایکی چپ، ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ شکار اور شکاری! منگل کے اپنے دوست، اپنے ساتھی، اکے والے گورداس نے جی کڑا کیا اور آگے بڑھتے ہوئے بولا..... ”دیکھتا ہوں یار، کون سا جگا ہے؟“

گورداس کے بڑھنے کی دیر تھی کہ کیسر سنگھ، جگو، نواب، اسماعیل، سب جھپٹ پڑے۔ ان کے جھپٹنے کی دیر تھی کہ منگل زرغے میں سے نکلنے کے لیے لپکا۔ پھر متداول ہر اول اور قلب سب طرف سے لوگوں نے اسے آلیا جس کے ہاتھ میں لائٹھی تھی، لائٹھی، جس کے ہاتھ میں جوتا تھا جوتا، منگل پر برسائے لگا۔ اگر وہ کچھ کرتا تو گنڈا سے اور ٹوکے بھی تھے.....

شور شرابہ من کر رہا گیر جمع ہو گئے..... منگل کو بالوں سے پکڑ کر بچ کھیتوں اور کھلیانوں کے گھسیٹا جا رہا تھا۔ سکھ ہونے کے ناتے نمبردار تارا سنگھ کیسر سنگھ کا فرض تھا کہ بالوں کو بے حرمتی سے بچاتے لیکن یہ کسب کرنے میں وہی پیش پیش تھے اور اس میں ایک مزا اور انتقام لے رہے تھے۔ گھسیٹے جانے کی اذیت سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے منگل کچھ دور تک اپنی مرضی سے ساتھ چل لیتا، لیکن پھر پیچھے کی طرف کھینچنے لگتا جیسے کسی اڑیل ٹٹو کو پانی پلانے لے جا رہے ہوں..... اس کے بدن، پھٹے ہوئے کپڑوں، لمبے لمبے کیسوں اور داڑھی میں دھڑکنے کی جھاڑیاں، کپاس کی سن چھٹیاں، مکئی کے ٹاٹے، خشک آگ میں سے اڑنے والی بڑھی مائیاں اور نہ جانے کیا کچھ گھسٹا آ رہا تھا۔

جو ہڑ اور دھرم شالہ کے بیچ تک پہنچتے پہنچتے یہ جلوس خاصا بڑا ہو گیا۔ مسافر سڑک کے ایک طرف رک کر حیرانی سے دیکھنے لگے۔ کیکر کی باڑ کے پیچھے سے اچک کر ایک رولہ گیر عورت نے گانو کی ایک ٹیاری سے پوچھا۔

”ہائے ہائے نی سنگھو..... یہ کیا ہو رہا ہے؟“

سنگھو نے عورت کی طرف اس نظر سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو..... ہو ہائے بے بے! اتنی سیانی ہو کے تو یہ بھی نہیں جانتی؟“ اور بولی..... ”شادی!“ اور پھر وہ لوٹ کر یوں دیکھنے لگی جیسے کوئی بات ہی نہیں۔

کوٹلے سے دور ویشنود یوی کے پہاڑ کا خاکہ اب بھی دھندلا سا نظر آرہا تھا..... اس وقت ضرور وہاں بے شمار جاتری پہاڑ کی پر کرما کرتے ہوئے جارہے ہوں گے کیونکہ اسی پورنیا کو ویشنود یوی میں جاتریوں کا اکٹھا تھا وہ ضرور ڈھولکیاں، چھینے بجاتے ہوئے گارہے ہوں گے..... بچاتا ہے تو بچالو، امبا جی! پاپیوں کے بچانے کی یہی بیلا ہے..... گاتے بجاتے ہوئے انھوں نے ضرور دکھن کی طرف دیکھا ہو گا اور ضرور..... ان کی نظریں کوٹلہ گانو کے دھندلکے، اندھیارے سے ٹکرا کر لوٹ گئی ہوں گی.....

گاؤں کے باہر یہی ایک نشیب تھا جو سرخ گیان چند اور اس کے مزدوروں سے پٹنا رہ گیا تھا جس میں منگل..... مار کھاتا ہوا منگل، بے سندھ ہو کر گر گیا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں بڑی بڑی کرسیوں اور کدالوں سے کھدائی کر کے جوہڑ کے پانی کو اندر لایا جاتا تھا اور پھر مٹی کی گول گول ٹنڈوں کی مدد سے اوپر جہلم ارا عین کی کیاریوں کی آبیاری کی جاتی تھی جس کی وجہ سے اس کی کھیتیاں سدا بہار رہتی تھیں۔ پھر ان پر پھر وائہہ کی سنسناتی ہوئی چھانو جس میں بے شمار مسافر سستا چکے تھے..... اس وقت کچھ دنوں کے لیے بند باندھ کر پانی کو روک دیا گیا تھا لیکن منگل کے چاروں شانے چت اس میں گرنے سے بند ٹوٹ گیا اور جو ہڑ کے پانی کے لیے راستہ بن گیا اور پانی تیزی کے ساتھ اندر آنے لگا۔ اس سے پہلے کہ لوگ منگل کو اٹھاتے اس کے کپڑے پانی سے گیلے اور منہ کچھ میں لت پت ہو چکا تھا۔ منگل نے کئی بار اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن آٹھ دس مضبوط بازوؤں کی جوڑیاں اپنے ارد گرد پا کر وہ شرابی کی طرح بنکارتا ہوا راستے پر ہولیا۔

عجیب سادہ لکھا تھا۔ بال بکھرے ہوئے اور سر پر پگڑی مدارو..... ہاتھ میں کند سی کرپان، سہروں کی جگہ جھاڑیاں اور کانٹے، کیسر کے چھینٹوں کی جگہ کچھ کے لودے، آنکھوں میں محبت کے نشے کی بجائے نفرت، عداوت اور ہزیمت کے آنسو اور گدلاپن

مالائیں، اور سانپ، منہ میں دھتورہ اور بھاگ، کمر میں لنگوٹ اور کاندھے پر مرگ جھالا اور ہاتھوں میں ترشول..... براتی بندر اور لنگور، شیر اور چیتے اور ہاتھی..... اس پہ شہنائی کے بجائے ایک عجیب طرح کی کاہش اور خواہش، وحشت اور شہوت پیدا کرنے والی کتا مکھی کی بھنبھناہٹ اور آٹے کی مشین کی کو..... کو..... کو..... کو!

جب منگل کورانو کے ساتھ بٹھایا گیا تو وہ لہو لہان تھا اور رانو مکمل طور پر بیہوش لیکن سب عورتوں کو یقین تھا، آخر میں سب ٹھیک ہو جائے گا..... اگرچہ چادر کی رسم معمولی ہوتی ہے اور اس میں بہت کچھ نہیں کیا جاتا لیکن یہاں چنوں اور پورن دئی اور وڈیا اور ککئی اور چنڈی نے مل کر ایک پوری شادی کا سامان کر دیا تھا..... ورنہ وہ سب ضائع ہو جاتا..... لڑکا عام طور پر لڑکی کے یہاں جا کر اسے بیاہ کر لاتا ہے لیکن اس وقت لڑکی کا مائیکہ بھی یہیں تھا اور سسرال بھی یہیں..... آگاہی بھی یہیں پیچھا بھی یہیں..... پورن دئی باہمی، وڈیا اور کچھ دوسری عورتیں لڑکی کے ماں باپ..... مائیکے کی طرف سے ہو گئیں۔ جنداں چنوں، سروپو، چنڈی اور سسرال کی طرف سے۔ سب ایک دوسرے کی سمدھنیں بنی، آمنے سامنے صف آرا ہو گئیں جیسے کوئی لڑائی لڑنے جا رہی ہوں۔ ماں کی حیثیت سے جنداں نے اپنے تقریباً پوپے سے منہ کو جنبش دی اور ”گھوڑی“ کا شروع کیا.....

ارے بھئی!

چھوٹی چھوٹی بوعدنیاں مینہ برس رہا ہے
سہاگن ماں تیرے شگن منار ہی ہے

اور پھر اس نے ہاتھ اونچا کر کے چنوں، سروپو اور سرامو غیرہ کی طرف اشارہ کیا جو ایک ہی ساتھ شروع ہو گئیں.....

بہن سہاگن تیری گھوڑی کی باگ پکڑے ہوئے ہے بھئی!

بھابی سہاگن سرمہ ڈال رہی ہے
اور باپ تیرا، زر کی تھیلی کا منہ کھولے کھڑا ہے!

اسی وقت بڑی، بھائیوں کی قطار لیے چھت پہ چلی آئی۔ چھوٹا چھوٹا پیچھے آنے اور
باجا سننے پر نچل رہا تھا۔ بڑی اسے منع کرتی، مارتی رہی لیکن اس کا اپنا جی وہ سب کچھ دیکھنے سننے
کو چاہ رہا تھا۔ چتوں موسیٰ کے ہاں سے نکلنے، کونٹھے پر آنے کی دیر تھی کہ سب ہی پیچھے آگئے
اور منڈیر پر کھڑے ہو کر اپنی ماں کی شادی دیکھنے لگے۔ بڑی پہلے آٹھ آٹھ آنسو روئی اور پھر
وہاں کارنگ دیکھ کر ایک بچی کی طرح سب کچھ بھول کر، نیچے کی طرف سرکنے لگی۔ وڈیا نے
چلا کر کہا ”اتو..... گاتی کیوں نہیں ہو؟“ اس پہ سب نے اپنی اپنی آواز بلند کر دی۔
تارا سنگھ، گیان چند، دیوانا، کیسر سنگھ، جگو، رلندو، ڈالا اور جمالا اور گانو کے مصنفی جو کچھ دور
کھڑے چور آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، ایک دم بول اٹھے..... ”گاؤ!“.....
”گاؤنا“..... اتنے میں رانو کو ہوش آگیا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کیا مرد اور کیا عورت
سب کو دیکھنے لگی، جیسا کہ دلہن کبھی نہیں کرتی۔ وڈیا نے گیت اٹھایا اور پھر باقی بھی سب کی
سب شامل ہو گئیں۔

پہلی پہلی وال تیری گھوڑی چڑے

اور میرا بتا..... لپک کر گھوڑی پر سوار ہو

اور چھوٹی سی بتوں کو لے کے محلوں میں آئے

اور پھر منظر لڑکی والیوں کے ہاں پہنچ گیا۔ پورن دئی نے سہاگ شروع کیے

راتی کے باپ کو خطاب کرتے ہوئے۔

بابل! تجھے نیند پیاری ہے

پارے! گھر میں کتیا کنواری ہے

سندر بٹی تیری برما بگتی ہے، ذرا بگتی ہے، اچھا سا گھر بگتی ہے

اوپر کسی نے منہ پر مٹھی گول کر کے باجے کی آواز نکال دی۔ بس پھر کیا تھا سب سمجھ گئے۔ برات آگئی۔ خوب ہی دھاچو کڑی مچی۔ گانوں کے سب بوڑھے، بچے، مرد عورتیں سامنے کے کھلے میدان میں، کنویں کے من پر، کوٹھوں کی چھت پر، درختوں کے اوپر، یہاں وہاں سب جگہ پہنچ کر بیٹھ گئے۔ پورن دئی اور اس کی طرار ساتھ دیا نے برات کی طرف اشارہ کر کے آئے ہوئے مہانوں کو بندر، سور بھڑدے اور جانے کیا کچھ کہا اور ایسا کرنے میں ہاتھ اپنے اپنے مردوں کی طرف اٹھا دیے جس پر خوب ہی کھلتی پڑی.....

سمحنیاں تاچیں، ڈومیاں تھرکیں..... جب ہی پورن دئی نے اپنی بانہہ اُلا ری اور وہ نظارہ گانوں کے لوگ آج تک نہیں بھولے حتیٰ چولی کے نیچے سے پورو کی ولایتی انگلیاں آنکھیں ماری تھیں۔ پھر اس نے دیا کے ساتھ مل کر کئی نمکین اور مرچیلی سٹھیناں دی تھیں۔

پودینے کی کروکڑا ہی رے
منگل کی ماں، رنڈی کی بیٹی آئی رے
ہمارا اچھا کرار پودینہ!

اس پر نواب کی بیوی عائشہ، جہلم ارا عین اور اس کی تین بیٹیاں عائشہ، عنایتی اور سلامتی بھی شامل ہو گئیں جیسے پودینہ صرف انہی کی ملک تھی..... اور سب ناچ مارچ اٹھیں.....

ہمارا اچھا کرار پودینہ!
مسالوں والا پودینہ!
منگل کی بہن تھانے داروں سے چھڑائی رے
پودینے کی کروکڑا ہی رے.....

پھر ہنسی کھیل، کلکاریاں جن میں مرد بھی شامل ہو گئے..... بچے بھی اور

بوڑھے بھی..... کون کس کی چوٹی کھینچ رہا تھا اور کون کس کو کلاوے میں لے رہا تھا، یہ کسی کو پتا نہ چلا۔ پورن دئی جمالے کی بانہوں میں پڑی تھی اور وہیں چل چل گئی۔ وڈیا سروپو کو لپٹ لپٹ رہی تھی..... بڑی نیچے آکر جو کھڑی ہوئی تو اسے کسی طرف سے دھکا پڑا اور آنکھ گیان چند کی جانتھوں میں جا کھلی جو اسے بڑے پیار، بڑی ہی شفقت سے بھیج رہا تھا۔ جب ہی چادر کھینچی اور شادی ہو گئی..... ایک ایک کی سب خاموش کھڑے ہو گئے، کیونکہ ڈولی رخصت ہونے کا سہ آگیا تھا مائیکے والیوں نے گانا شروع کر دیا۔

بائل! اب تیرا کیا دعوا ہے؟

دولہا کا باپ ڈولی کی متیاں پکڑے کھڑا ہے، اب دعوا اس کا!

بھیا! تیرا اب کیا دعوا ہے

دولہا کا بھائی ڈولی کے بازو تھامے کھڑا ہے، اب دعوا اس کا!

اور پھر ایک..... واحد بین اڑکی کا.....

بائل!..... طاقتوں میں میری گڑیاں بکھری ہیں لیکن مجھے کھیلنے کا چاؤ نہیں

بائل! انگ سہیلیاں یہاں وہاں سے مجھے ملنے آتی ہیں لیکن مجھے ان

سے بھی ملنے کا چاؤ نہیں!

..... ہائے روتی ماں کی انگلیاں سج گئی اور باپ تو دریا رو رہا ہے..... پھر منہ دکھائی اور

جگ ہنسائی..... آخر سر جوڑی!

پہلے رانو کو اور پھر منگل کو پکڑ کر کوٹھری میں دھکیلتے ہوئے باہر سے تالا لگا دیا گیا

جسے چمپوں، دونوں جڑواں بھائی اور بڑی دیکھ رہے تھے اور اپنی آنکھیں جھپک رہے تھے.....

(۷)

اس رات رانو ایک بہن بیوی اور ماں کی طرح منگل کے زخموں پر سینک کرتی رہی۔ باہر تو جانہ سکتی تھی اس لیے وہیں دوپٹے کو منہ میں ٹھونس کر وہ اس میں اپنے گرم گرم سانس کی دھونکنی چلاتی اور منگل کی سو جن پہ رکھ دیتی۔ اسے آرام بھی آرہا تھا اور بیچ بیچ میں وہ کراہ بھی رہا تھا۔ کبھی کبھی درد بغیر پتا دیے، بنا خبردار کیے شعور کی تہوں میں کہیں گم ہو جاتا تو منگل کو رانو کے ہاتھ عجیب سے لگنے لگتے۔ شاید ان ہاتھوں میں رچی ہوئی منہدی کا رنگ اس اندھیرے سے بھی تیکھا تھا اور بو اس کھٹے سے بھی تیز جو سردی اور گرمی کے ملاپ میں ایک دم مہک اٹھتا ہے اور پھر دل میں ایک عجیب طرح کی ان کہی، آنکھ میں عجیب طرح کے آنے بے چھوڑ کر، چند ہی دنوں میں پت چھڑکا شکار ہو جاتا ہے۔

رانو یکسر بھول چکی تھی اس کے بچے کہاں ہیں؟ کیسے سوئے ہیں؟ ان میں سے کسی نے کچھ پیٹ میں ڈالا بھی ہے یا نہیں؟ ایک بار چموں کی شبیہ لپک کر اس کی سوچ میں آئی اور پھر ویسے ہی، اپنے آپ چلی گئی۔ یہاں جو کچھ ہو رہا تھا وہ چموں سے کہیں بالا تھا۔ چموں اور اس کے ساتھ کے لاکھوں کروڑوں بالک اس کا ایک حصہ تھے اور بس کبھی بیچ میں منگل بدک کر پہلو موڑ لیتا تھا۔ پھر رانو ایک طرف جا کر بیٹھ جاتی اور دبی دبی سسکیاں لینے لگتی جو تخلیق سے پہلے ہر عورت کا مقدر ہوتی ہیں۔ ایک اکی اسے پیاس لگی لیکن کھڑکی کھول کر کسی کو پانی کے لیے کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔..... پھر منگل بھی اٹھ کر بیٹھ گیا اور اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ایک اکی اس پر کوئی پاگل پن کا چکر آیا اور دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنا

رہا سہا کرتا بھی پھاڑ ڈالا..... ”میں مر گئی“ رانو چلائی اور اس کے پاس چلی آئی
”پرے ہٹ جا“ منگل نے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

..... پچھلی رات رانو نے منگل کے پانو پکڑ لیے اور ان پر سر رکھتی، روتی ہوئی بولی
”تو تو جانتا ہے منگلا، اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔“

منگل جواب تک مضحک ہو چکا تھا بولا..... ”جانتا ہوں“ اور پھر نہ جانے کس
جذبے سے اس نے رانو کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اندھیرے میں مسلسل دیکھتے رہنے سے اسے پتا چلتا
سوئی سوئی دکھائی دینے لگی تھی.....

رانو نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں رہنے دیا اور دھڑکتے ہوئے دل سے انتظار کر
نے، دیکھنے لگی، اس کی تقدیر کا ساتھی، اگلے لمحے، اس منہدی رچے ہاتھ کو اپنے گریخت
چھانٹنے والے ہاتھوں میں رہنے دیتا ہے، یا جھٹک دیتا ہے؟ لیکن ایسا تو کچھ بھی نہ ہوا۔ منگل کا
ہاتھ جیسے اپنے آپ نیچے گر گیا اور ساتھ رانو کا بھی..... باہر لوگ ہمیشہ کی طرح یہی
سمجھتے رہے..... شادی ایک مسلسل شب زفاف کے سوا کچھ بھی نہیں۔ کچھ لوگ
تو سرے ہی سے نہ جانتے تھے اور جو جانتے تھے ان لحوں کو بھول چکے تھے جو ان پر بھی آئے
تھے جو تپیدگی اور جہان اور ہسٹر اژدو دلوں کے بیچ پیدا ہوا تھا..... شب زفاف کی لذت
اس کے مقابلے پہ ایسی ہی تھی جیسے کوئی مفروضہ حاتم سے مہر میں مانگنے جائے۔ اپنے ساتھ
پوری انسانیت اور اس کے دقار کو اس کے قدموں پہ جاگرائے اور اس کے عوض میں ایک
دھڑی پائے..... اس پر بھی دعائیں دیتا ہوا گھر چلا آئے.....

صبح جب رانو اور منگل براگے تو کسی نے تالا کھول دیا تھا۔ منگل اٹھا۔ اس نے چلنے کی
کوشش کی لیکن وہی قدم کے بعد کہہ رہا ہوا لوٹ آیا اور روتے ہوئے اپنے عروسی بستر پہ
گر گیا۔ رانو بھاگ کر باہر پہنچی اور جا کر ماں جنداں کے پاس کھڑی ہو گئی۔

”کیا ہے بہو؟“ جنداں بولی۔

اس پر رانو نے کہا ”بھنڈارے کی چابی دو ماں“
 ”وہ کس لیے؟“

”ہلدی کا لٹا ہے، اسے بہت مار لگی ہے۔“

جنداں نے اپنے دوپٹے کو پلو سے چابیاں کھول کر رانوں کو دے دیں، بھنڈارے کی طرف جانے کی بجائے رانو پر آمدے کی طرف لپکی جہاں بچے آدھے، ننگے، آدھے ڈھکے ہوئے سو رہے تھے۔ رانی نے باری باری سب کا منہ چوما اور ان کے بازوؤں، ٹانگوں میں اڑی ہوئی چادریں کھینچ کھینچ کر ان کے جسموں کو ڈھانپا۔ گلابی سی سردی سے ہاتھ رانو میں دیے، سکڑے ہوئے بچے ایک تسکین کے احساس سے سیدھے ہونا شروع ہوئے لیکن جب رانی بڑی کے پاس پہنچی تو وہ جاگ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ رانو اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتی، بڑی نے اپنے بڑے بڑے ناخنوں سے ماں کا منہ نوچ لیا اور بولی..... ”جاتو..... اسی سے منہ کالا کرو۔“

رانو پر پہلے کیا کم گزری تھی کہ اس پر بیٹی نے بھی منہ نوچ لیا! وہ تو بڑی کو یہ بھی نہ کہہ سکتی تھی..... بیٹی! تیرے ہی لیے تو میں نے یہ سب کیا ہے اور تو اور تو بھی؟ لیکن اس کے پاس یہ سوچنے کی فرصت ہی کہاں تھی؟ وہ تو یہ بھی نہ سوچ سکتی تھی..... اس کی بیٹی، اس کی اپنی جیسے اس نے نو مہینے پیٹ میں رکھا، ہزار اذیتیں سہہ کر آخر ایک دن جاتکا ہی کے عالم میں اس دنیا میں لائی، بے بسی اور میلے سے دھوئی روتی ہوئی پالا، بڑا کیا اور اب بڑی ہو کر اس نے منہ نہیں نوچا..... پھول برسائے ہیں! رانی ایک کند اور خالی ذہن کے ساتھ اندر ہلدی لینے کے لیے چلی گئی جسے نکال کر اس میں تیل ڈال کر، توے پہ پکایا اور پھر منگل کی چوٹوں پر باندھنے کے لیے لے چلی..... اندر پہنچی تو منگل وہاں نہ تھا۔ شاید جب رانو اپنی ساس کے پاس تھی وہ کہیں نکل گیا تھا۔ رانو دوڑ کر باہر دروازے تک گئی..... منگل کا کہیں سایہ تک نظر نہ آیا۔ البتہ ڈبو پاس آ کر دم ہلانے، چوں چوں کرنے لگا

اور اگلے پنجے اٹھا اٹھا کر رانو پہ رکھے جیسے کہہ رہا ہو..... میں جانتا ہوں رانی! تیرے ساتھ کیا ہوا؟ سب ٹھیک ہو جائے گا، آخر سب ٹھیک ہو جائے گا.....

چنوں روز سویرے مندر جلایا کرتی تھی اور صبح کی دو دو حیا خنکی پہ اس کی آواز پیرتی ہوئی آیا کرتی ”مکڑاں تیں رام نہ جانتا رہے“..... لیکن آج مندر جانے کی بجائے وہ سیدھی رانو کے ہاں چلی آئی۔ رانی بھی اسے دروازے میں کھڑی مل گئی، چھوٹے ہی چنوں نے پوچھا۔

”کیوں رانی؟ سب سکھ ہے نا؟“

رانی چپ رہی۔

”بول نا“ چنوں پوچھنے لگی۔ اس پر بھی جب رانی کچھ نہ بولی تو چنوں نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا ”بول، رات کچھ ہوا؟..... ہائے کیسی گھنگھنیاں منہ میں ڈالی ہیں؟“

جو گھنگھنیاں رانو نے منہ میں ڈالی تھیں، ان کے بارے میں کیسے بتاتی؟ اس کے کھولتے پانی کی تپش اور جلن، جن میں اس کے جذبات، ان کی کاشت اور حاصل برداشت کا دانہ دانہ تک اُبل گیا تھا، جل گیا تھا، چنوں کو کن الفاظ میں بیان کرتی؟ نیچے دیکھتی پھڑکتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ رانی بولی..... ”رات کچھ نہیں ہون۔“

چنوں نے غور سے رانو کے چہرے کی طرف دیکھا اور بولی..... ”جھوٹ بکتی ہے؟..... تھلا اچھا تیرے منہ پر یہ ناخنوں کے نشان کیسے ہیں؟“

ٹھنڈے پینے کے قطرے رانو کے چہرے پہ چلے آئے اور وہ کچھ نہ بولی۔ کچھ دیر یوں ہی بیکار، شرمسار سی کھڑی رہنے کے بعد جیسے وہ ایک اکی اُبل پڑی۔ تو جو کہتی ہے چنوں! مجھے اس کی ضرورت نہیں..... میں تو تن ڈھانپنے کے لیے دو کپڑے مانگتی تھی، بھیناں!..... پیٹ میں ڈالنے کے لیے دو روٹیاں..... پتا نہیں واگور و پرماتما کو کیا منظور ہے؟

دیوی ماں کیا چاہتی ہے؟..... وہ اب پھر چلا گیا ہے کہیں.....“

”ہائے رام!“ جنوں نے پیچھے گلی کے اندھیرے کو صاف ہوتے ہوئے دیکھا اور کہنے لگی ”کدھر گیا مواء، مت پلتا؟“ اور پھر ایک دم کسی غلطی کا احساس کرتے ہوئے بولی ”میں منہ جلی..... تیرے سامنے تو اب مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے۔“

رانو مسکرا دی..... جیسے رورہی تھی یا رودی، جیسے مسکرا رہی تھی

جنوں رانو کو دلا سادیتے ہوئے کہنے لگی۔ ”اس کی تو فکر نہ کر رانی! جیسے وہ گیا ہے، بی

با! ویسے ہی آ بھی جائے گا۔“

اور دوپہر کے قریب منگل سچ سچ ہی چلا آیا۔ اس نے نواب کا کرتا پہنا ہوا

تھا۔ اسماعیل کا صافہ اور گورداس کا گامے شاہی جوتا۔ بدن پر پٹیاں بندھی تھیں۔ اس کا خیال

تھا گھر کی ہلدی ولدی سے کچھ ہونے ہوانے کا نہیں، اس لیے وہ صبح کے پہلے ہی پھیرے

میں اسماعیل کے ساتھ اس کے اکے پر نکل گیا تھا اور ڈسکے کے بڑے اسپتال میں جا کر پٹی

کروا آیا تھا..... صبح سے کچھ پیٹ میں ڈالا تھا یا نہیں، خدا جانے..... کل سے تو

صرف مار کھائی تھی اور یا پھر..... شادی کی تھی۔

دن بھر منگل کھاٹ بیٹھا زمین کے تنکے گنتا رہا۔ کبھی وزن میں اپنا آپا سے ایک تنکے

سے بھی ہلکا معلوم ہونے لگتا اور کبھی پوری زمین سے بھاری۔ پھر کبھی بیچ میں جھک کر، انگلی

سے وہ کچی زمین پہ ”اونسیاں“..... قسمت کی لکیریں کھینچنے لگتا لیکن جب انھیں گنتا تو وہ

جفت ہی آتیں، کوئی طاق نہ بچتی۔ قسمت کہیں راستہ نہ دیتی۔ جھلا کر ہاتھ چھپلاتے ہوئے

اس نے بھاگوں کے سب لیکھ مٹا دیے اور اٹھ بکھڑا ہوا۔ ایک اضطرابی کیفیت سے چہرہ

صاف کیا تو سب دھول منہ پر چلی آئی۔ اپنی طرف سے صفائی کے عمل میں وہ اور بھی گندا

تقدیر آلود نظر آنے لگا تھا۔

جب ہی ہاتھ اٹھا اٹھا کر وہ بکائن پر آکر بیٹھنے والے، کرخت آواز میں کائیں کائیں

کرنے والے ڈھوڑوں..... پہاڑی کوؤں کو اڑانے، گانوں کے گولی جو گے آوارہ کتوں کو
ایک نیم جان، خارش زدہ کتے پر جھپٹنے سے روکنے لگا..... پھر ایک طرف سے کہیں
آدمی درجن کے قریب کتے، ایک دوسرے پر جھپٹنے، غراتے ہوئے چلے آئے جنہیں
بھگاتے ہوئے منگل بول اٹھا..... ”میں حیران ہوں یار!..... کوٹلے میں جو بھی
مرتا ہے، شاید کتابی بن جاتا ہے.....“

کچی دیوار پر سے دور دھولا دھار اور ہمالہ کے سلسلہ ہائے کوہ کہیں ایک دوسرے میں
کھپ گئے تھے اور ان کے بیچ کہیں کہیں برف چمکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ ان پہاڑوں
سے ادھر دکن کا وہ علاقہ تھا جس کی ٹیکریوں پہ پہاڑی کے سوزنے جنم لیا تھا کیونکہ یہاں
کے عاشق اور معشوق کبھی آپس میں نہ مل سکے تھے۔ ایک اس ٹیکری پہ ہوتا تو دوسرا اس پر،
اور بیچ میں دریا۔

پاپی لوگ پہاڑ دے، پتھر جن کے چٹ
انگ ملاوا کبھی کبھی، نین ملا دانت

اور ان کی جدائیوں کا درد، راوی چناب اور جہلم کے کنارے کنارے ہوتا ہوا
وارث شاہ اور قادیار کے صوت میں ساندل اور گنجی بار کے دل تک پہنچ گیا تھا.....
ایک ایک کر کے گزرے ہوئے واقعات منگل کے دماغ میں آنے لگے۔ اس نے ایک سرد
آہ بھری اور مرزے کی آواز میں گنگنانے لگا۔ ”تو نے برا کیا، صاحبان..... جو میری بچی
کی گاڑی باندھ دی میرے تیر و ترکش ٹانگ دیے ورنہ ایک تیر سے تیرے بھائیوں کو کھپت
کر دیتا اور دوسرے سے اسے جس کی تو منگیتر تھی.....“

لیکن شاید منگل کے فگار دل کے لیے مرزا صاحبان

چنانچہ ایک کان پہ ہاتھ رکھ کر، دوسری بانہہ اُلا رتے ہوئے

چھٹن شاہ فقیر سے ایک جاٹنی عرض کرتی ہے..... میں سالم بکرا تیری نیاز گزاروں اگر

میرے سر کا سائیں مر جائے پانچ سات پڑوسنیں ہلاک ہو جائیں اور جور ہتی ہیں انھیں تپ آئے۔ گانوں کے نمبر دار کو ہنگی پڑلے جو تھانے میں ریٹ کرتا ہے کراڑے۔۔۔۔۔۔ عیسے کی باٹ جل جائے جہاں ہمیشہ دیا جلتا ہے۔ فقیر کی کتیا مر جائے جو دن رات چوں چوں کرتی رہتی ہے۔۔۔۔۔۔ گلیاں سونی ہو جائیں۔۔۔۔۔۔ اور میرا محبوب بنا روک ٹوک کے آسکے۔۔۔۔۔۔“

یوں جی کو آسودہ کر کے، منگل اندر جا کر لیٹ گیا۔ جب تک فضا میں سے کشت و خون نکل گیا تھا۔ شمس، دوپہریں اور شامیں ڈھلنے لگیں، جیسے وہ کوئی میلی دیواریں تھیں اور کوئی آسمان کے دریائے درد سے منکوں پانی لے کر، کرنوں کی جھاڑو سے انھیں دھوا گال رہا تھا۔۔۔۔۔۔ رانو نے کھانا پکایا۔ پھر بھاگ کر چنوں کے ہاں سے تھوڑا سا گھی لے آئی اور ایک بیوی کی طرح اس کی بڑی سی مقدار روٹی پر رکھ دی۔ وہ روٹی پہ ”چونگھا“ نکالنے ہی والی تھی کہ کسی خیال کے آنے سے رک گئی، شرمائی اور ہاتھ کھینچ لیا۔

کچھ دیر میں، کھانا ڈالنے کے بعد اس نے بڑی سے کہا ”جااے دے آ“

بڑی نے نتھنے پھلا کر شانے جھٹک دیے اور بولی۔۔۔۔۔۔ ”میری جائے ہے

جوتی۔“

رانو جھل ہو کر خود ہی اٹھنے والی تھی کہ پاس بیٹھا ہوا چوں بول اٹھا۔۔۔۔۔۔ ”لاماں

میں دے آتا ہوں۔“

رانو نے چوں کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔۔ جیسے یہ اس کا بچپن تھا، اس کی معصومیت ہی تھی جو رانو کے دکھ کو سمجھ سکتی تھی۔ یہ بچپن اور معصومیت جو کردہ و نا کردہ گناہوں سے کہیں اوپر تھے۔ رانو کا جی چاہا اسے چھاتی سے لگالے، بھینچ لے، یوں بھینچ لے کہ وہ پھر سے اس کے بدن میں تحلیل ہو جائے اور اس دنیا میں نہ آئے جہاں۔۔۔۔۔۔ جب ہی اس نے

تھلا جھلا کر آگے سر کا دیا اور خود دوڑے میں منہ جھاکر رونے بیٹھ گئی۔

یوں دن بیت گئے۔ مہینے بیت گئے۔ منگل کے دل میں آہستہ آہستہ ایک ذمے داری کا احساس جیسے اپنے آپ پیدا ہونے لگا اور وہ چار چار پانچ پانچ روپے کما کر گھر لانے لگا۔ اگرچہ رانو کے ساتھ اس کامیاں بیوی کا رشتہ نہیں تھا۔ اس پر بھی وہ روپے لا کر ماں کے ہاتھ میں دینے کی بجائے رانو ہی کے ہاتھ میں دیتا اور رانو خوش ہوا ٹھٹی اور اُداس بھی۔ ڈر سے ملا جلا ایک استحکام کا جذبہ اس کے دل میں جگہ پانے لگا۔ گانو بھر کی عورتیں، کیا چنوں اور کیا پورن دئی کیا دویا اور کیا سر و پوسب نے ”کچھ ہوانی.....نی کچھ ہوا؟“ پوچھ پوچھ کر غریب رانو کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ رانو جواب میں صرف اتنا ہی کہتی..... ”رٹو! شکر نہیں کرتیں میرا گھر بس گیا ہے، روٹی کپڑا ملنے لگا ہے مجھے؟ اب مجھے کوئی اس گھر سے نہیں نکالے گا۔ کوئی میری بیٹی کو نہیں بیچے گا.....“

لیکن..... وہ سب شہد کی مکھیاں یوں ہی چھوڑنے والی تھوڑے تھیں؟ دیر تک وہ رانو کے ارد گرد بھنھناتی رہتیں اور اس کے کو لھوں میں چپے دے دے کر پوچھتیں..... ”کیا مطلب؟..... ساری رات وہ ایسے ہی پڑا رہتا ہے؟“

”ہاں“

”تو ادھر اور وہ ادھر؟“

”ہاں“

”تو بھی اسے بلانے کی کوشش نہیں کرتی؟“

”نہیں“

”کیوں نہیں..... ناس پیچھے؟..... وہ تیرا وہ ہے، شادی کی ہے تیرے

ساتھ..... چادر ڈالی ہے تجھ پر؟“

رانو دنگھی ہوا ٹھٹی اور بول اٹھتی ”چادر ڈالی ہے تو کیا ہوا؟..... مجھے اب بھی

وہی لگتا ہے جیسے پہلے لگتا تھا.....“

اس پر سب بنگارا ٹھٹھیں..... ”ہو ہائے“ بکھٹے منہ ”در لعنت“ اور پھر وہی ”تمہیں نیند کیسے آتی ہے؟“
”جیسے پہلے آتی تھی۔“

”وہ بھی سو جاتا ہے بس..... ایسے ہی؟“
”ہاں“

”رات کو اٹھتا کڑتا..... جمای بھی نہیں لیتا؟“

اس پر سب ہنس پڑتیں اور ایک دوسرے کو ”چھبیاں“ دینے لگتیں اور آخر سمجھاتیں ”تو کچھ کر، گشتی جمانے کی نہیں تو ہاتھ سے جاتا رہے گا۔“
پوروچ میں بول اٹھتی..... ”کہو تو تجھے ایک ٹونا لادوں؟“
”ہاں نی“ وڈیا حامی بھرتی۔

”نہیں نہیں“ رانو کہتی..... ”میں کوئی ٹونا ودنا نہ کروں گی۔ تو پھر بیٹھ کے روئے گی۔“ پورو تنہا کہتی۔

وڈیا معنی خیز انداز میں پورو کی طرف دیکھتے ہوئے بول اٹھتی ”تو تو نہیں روتی تا؟“
پورو ایک دم اپنی شرم اور لاج کو ایک طرف رکھتی، اپنی جوتی کی طرف اشارہ کرتی ہوئی کہتی میری روتی ہے یہ..... میں ٹونا نہ لاتی، میرا شہو پیدا نہ ہوتا تو یہی چاہا تمہارا مجھے گھر سے نکال دیتا.....“ اس پر سب کھلی کپاس کی طرح ہنس ہنس پڑتیں اور پورو نے رتی ایک بڑی سی آنکھ پھیلا کر، سب کو چاروں طرف دکھا کر مارتی۔ تسپا چنوں پوچھ لیتی..... ”باواہری داس کے دن رو گئے؟“

”جب ہی پورو نے رتی، چنوں کی چوٹی پکڑ کر یوں کھینچتی کہ سب.....“ میں مر گئی،
ہائے مر گئی.....“ کے بلو میں ختم ہو جاتا۔

اکثر پوچھتے رہتے..... ”کیوں پھر کیسی لگی؟“ اور منگل کا چہرہ ایک دم لال ہوا اٹھتا۔ اسے یوں معلوم ہونے لگتا جیسے کسی نے اس کی ماں، بہن کے بارے میں کوئی بات بے احتیاطی سے کہہ دی ہو۔ وہ چپ رہتا اور بیکار بکی کے ساز میں بکس کسے، یا گھوڑی کو تھکنے لگتا۔ گور داس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہہ اٹھتا

”بچ پوچھو تو دوہا جن ابکی بڑی موج ہوتی ہے؟“

”موج کیسی؟“ نواب لقمہ دیتا..... یا اسما عیل..... یا کوئی اور

”وہ پہلے ہی رسی بسی ہوتی ہے نا؟..... سب جانتی ہے۔“

اس پر سب مل کر ہاہا، ہو ہو کرنے لگتے جس کے بیچ میں منگل کی پاٹ دہر آواز آتی..... ”ٹھہر دو تمہاری ماں کا.....“ اور سب ایک ایک چپ ہو کر منگل کی طرف دیکھنے لگتے۔ صرف گور داس ہمت کرنا کیونکہ وہ تن و توش کے اعتبار سے مضبوط تھا اور اس پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے ہر کسی کو سوچنا پڑتا تھا۔ وہ کہتا۔ ”اسے ماں بنانے کے لیے بیاہ کیا ہے، اوئے چادر ڈالی ہے.....؟“

منگل ایک کڑی نگاہ سے اس کی طرف دیکھتا لیکن مصلحت کو بہادری سمجھ کر چپ رہتا۔ تھوڑی دیر میں گدلائی ہوئی فضا صاف ہوتی اور اسما عیل کوئی لطیفہ شروع کر دیتا..... یا کثیفہ..... ایک سردارجی کی اکئی کچھڑ میں گر گئی؟“

”پھر..... پھر کیا ہوا؟“ نواب منگل کی طرف دیکھتے، مزا لیتے ہوئے پوچھتا۔ جب بھی بیچ میں کوئی سواری چلی آتی اور نواب اس سے مخاطب ہو جاتا..... کوٹلے چلے گی مائی؟“

”نہیں ویرا“ مائی کہتی اور چلی جاتی..... نواب پھر اسما عیل کو پکڑتا۔ ”ہاں تو سردارجی کی اکئی کچھڑ میں گر گئی.....؟“

”ہاں“ وہ بیان جاری رکھتا ”اور وہ کچھا پہنے ہوئے کچج میں کود پڑے اور لگے اکنی ڈھونڈنے..... اور اوپر ہاتھ اٹھا اٹھا کر کہتے..... اللہ مل جائے! یا اللہ مل جائے..... ایک مسلمین پاس سے گزرا۔ اللہ کا نام سن کر ٹھہر گیا اور بولا..... ”اوائے سردار! تو ہمارے اللہ سے کیوں کہتا ہے؟ اپنے واگورو سے کیوں نہیں؟..... سردار جی نے اوپر دیکھا اور بولے..... اونہہ! اکنی کے لیے واہ گورو کو کچڑ میں ڈالوں؟“

اس پر سب کھاتی مار کے ہنس دیتے۔ منگل بھی مسکرا اٹھتا اور اسماعیل اسے اجازت نامہ سمجھ کر اس کے پاس پہنچتا اور کہتا..... ”منگلا! یہ ٹھیک ہے، سرداروں کے بارہ بجتے ہیں؟“

”ہاں بجتے ہیں“ منگل اقرار کرتا۔

”تیرے بھی بجتے ہیں؟“

”ہاں! میرے بھی بجتے ہیں۔“

”پھر منگل کے جوئے“ یہ ہاتھ رکھتے ہوئے اسماعیل پوچھتا۔

”یہاں کچھ ہوتا ہے؟“

”ہاں ہوتا ہے“ منگل پیچھا چھڑانے کے لیے مان لیتا لیکن اسماعیل اسی پر بس نہ کرتا

بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ کہتا ”سن..... یہ تھیں دن کے بارہ بجے ہی ہوتا ہے یا رات کے بارہ بجے بھی؟“

”دن کے..... جو اصلی سیکھ ہے اسے تو دن کے بارہ بجے ہی ہوتا ہے.....

اتنے بال اور گرمی کتنی پڑتی ہے۔“

”تو پھر.....؟“ اسماعیل کہتا ”وہ اپنے گانو کا وسا کھا سنگھ ہے نا..... ترکھان

..... وہ تو رات کے بارے بجے بہت ”کھرود“ کرتا..... شور مچاتا ہے“

منگل جواب دیتا..... ”وہ حرمہ لاد..... حرمہ لاد.....“

اور سب مل کر ہنسنے لگتے۔ منگل کی آواز سب سے بلند ہوتی۔ پھر بیچ میں کوئی جاترن چلی آتی اور سب مل کر اسے لپک لیتے۔ اس کی گٹھری نواب کے لکے میں ہوتی، جوتے منگل کے لکے میں اور وہ خود گورداس کی بانہوں میں۔ اکثر ایسا ہوتا میاں ایک لکے میں ہوتا اور بیوی دوسرے میں اور بچہ تیسرے میں۔ بہت ہی گالی گلوچ کے بعد سب مل کر کسی ایک کا اکا بھر کر روانہ کر دیتے اور خود دوسری سواریوں کے پیچھے بھاگنے لگتے۔ منگل کو اب عورتوں میں صرف سواری کی حد تک دلچسپی تھی۔ وہ کبھی کسی نوجوان لڑکی کو دیکھتا بھی تو ایک سرسری نظر سے..... جیسے کہہ رہا ہو، ہاں ایسی بھی ہوتی ہیں..... سلاتے میں اسے اب بھی دلچسپی تھی۔ اس لڑکی کو عورتوں کی ڈاک سے پتا چل گیا تھا کہ منگل اور اس کی بیوی میں ابھی تک کچھ وہ نہیں ہوا..... وہ اور بن سنور کر اس کے سامنے آتی اور سیروں کے اشارے کرتی لیکن اندر سے وہ جلی بیٹھی تھی۔ اس نے فیصلہ کر رکھا تھا۔ ایک دن منگل کو اپنے چنگل میں پھنساؤں گی..... ڈھارے کے پیچھے کپڑے اترواؤں گی اور جب وہ ہاتھ بڑھائے گا تو شور مچا دوں گی اور اس کی وہ بے عزتی کراؤں گی کہ یاد ہی کرے..... اب جب کہ وہ بیوی والا ہو چکا۔ ہے، اس کا منہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کالا ہو جائے گا.....

اس دن نصیبوں والے اڈے پہ منگل نے نواب کے ساتھ پی لی..... لیکن ڈرتے ڈرتے۔ اپنے بھائی کے زمانے میں تو وہ بوتلیں لٹا دیا کرتا تھا لیکن اب وہ ڈرتا تھا۔ اسے پینے کی خواہش تھی لیکن یوں بے تنگے پن سے نہیں۔

رانو بھی عام عورتوں کی طرح تھی جو شادی کے پہلے ہی روز سے اپنے شوہروں کے چہرے دیکھنا سیکھ جاتی ہیں۔ اس پر آنے والے ایک ایک شکر کو جاننے پہچاننے لگتی ہیں جب ان کا کام کوئی گناہ کر کے آتا ہے تو انھیں لامحالہ پتا چل جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ کچھ نہیں کہتیں۔ باتیں کرنے میں وہ ان کی زیر زبرد کچھ لیتی ہیں بلکہ چوکھٹ کے اندر پہلا ہی قدم ان کی پوری جاتک، پوری الف لیلیٰ ان کے سامنے دہرا دیتا ہے..... اس سے

پہلے بھی منگل نے دو چار بار پی لی تھی اور وہ جان گئی تھی..... منگل کو بھی معلوم تھا کہ وہ جان گئی ہے..... لیکن اس پر بھی خاموشی کا پردہ پڑا رہا اور ایسے ہی نہجی رہی.....

جوں جوں دن بیتے گئے، گانوں کی عورتیں، رانو کو ڈانٹنے ڈپٹنے لگیں اور سوچنے لگی شاید یہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں..... وہ ڈرنے لگی، اپنے مستقبل سے، اپنے بچوں کے مستقبل سے کیونکہ بیچ بیچ میں منگل الف ہوا اٹھتا تھا..... ”ہٹاؤ یہ سب..... کیا تماشا بنا رکھا ہے۔“ اور رانو کانپ جاتی۔ وہ منگل کو کچھ بھی تو نہ کہہ سکتی تھی۔ اس پر اس کا حق ہی کیا تھا؟..... نہیں نہیں، حق تو تھا..... پنچایت کی موجودگی میں گانوں کے سب مرد عورتوں کی گواہی میں، اس نے مجھ پر چادر ڈالی تھی..... سو مجھے تو حق ہے بھی اور نہیں بھی۔ چادر کا کیا ہے؟..... اڑھائی تین گز کا کپڑا..... ایسا کہیں تو شادی کے پھیرے بھی کیا ہیں؟ یہ سب ٹھیک ہے۔ نہیں، کچھ بھی ٹھیک نہیں..... تلو کا بھی تو تھا اس سے وہ اتنی خائف نہ رہا کرتی تھی۔ جو منہ میں آتا دھڑ سے کہہ ڈالتی۔ چاہے بعد میں مار ہی کھاتی۔ میں اسے کیوں نہیں کچھ بھی کہہ سکتی.....؟ منگل رانو پر انگلی بھی نہ اٹھاتا تھا۔ سوائے رات کے، اس جگہ پر کھڑا بھی نہ ہوتا جہاں رانو کی پرچھائیں پڑتیں۔ پھر بھی..... اس کا کیا مطلب؟..... چلو اچھا ہی ہے، مار تو نہیں پڑتی۔ ہڈیوں کو سینک تو نہیں کرنا پڑتا لیکن..... بہت دنوں تک سوچتے رہنے کے بعد رانو سمجھ گئی کہ وہ منگل کو کیوں کچھ نہیں کہہ سکتی؟ دوسری عورتیں جو ناپ شناپ منہ میں آئے بک دیتی ہیں۔ دن چھٹا، رات زیور کچھ نہ کچھ مانگتی ہی رہتی ہیں اور اسے لاکے دینا پڑتا ہے.....

آج دن کچھ اندر باہر تھا جب منگل قصبے سے لوٹا۔ سورج کی روشنی ابھی آسمان پر ہونے سے اٹھم کا بے نور چاند سفید سی چنگ کی طرح ایک کیکر میں الجھا ہوا تھا اور اب اکے کے ساتھ ساتھ بھاگتا ہوا سا ہنسیوں کی ٹھنسی کے اوپر، آسمان کے کھلے میدان میں جا کر ساکت ہو گیا جہاں منگل اپنا اکار کھ دیا کرتا تھا اور کچھ کو تھوڑا چارہ دائرہ ڈال کر گھر چلا

آتا..... پھر لوٹ آنے، اسے کھریا کرنے اور دنہ ڈالنے کے لیے..... باقی کا کام اگلی سویر پر ملتوی.....

اگا اور بکلی کا بندوبست کرنے کے بعد منگل لوٹا جہاں وہ اگا کھڑا کیا کرتا تھا۔ وہاں سے دائیں طرف فارم کی پندرہ پندرہ فٹ اونچی ایک کھڑی تھی جس کے بیچ میں سے چوٹی بھی نہ گزر سکتی تھی۔ البتہ جھینگر، دن بھر اپنی ہی دم میں سے لیس نکال کر ایک تار بٹاتے اور جھولتے جھلاتے ایک گئے سے دوسرے گئے تک پہنچ جاتے اور پھر اس کے رس میں ڈوب کر اگلے گئے کے پاس..... بائیں طرف مکان شروع ہوتے تھے جن میں سب سے ادھر مدرسہ تھا اور اس کے ساتھ والا مکان جہلم ارا عین کا جس کے ادھر جا کر اب چاند تھم گیا تھا.....

فضا میں سے ایک قسم کی خوشبو آرہی تھی۔ منگل جانتا تھا وہ خوشبو کیسی ہے؟..... بات یہ تھی گانو کے کسان ہر سال اسی مہینے رس نکالتے، گڑ بٹاتے اور ایک کے بیچ میں تھوڑی سی جگہ خالی کر کے، زمین کھود کے، گڑ سے بھرا ہوا مٹکا اس میں رکھ دیتے اور نیکر کی چھال اس میں ڈال کر اوپر گوبر اور گھوڑے کی لید ڈال دیتے..... کچھ دن میں مٹکا چلنے ”بولنے“ لگتا اور بڑبڑ کرتی ہوئی شراب مشکوں سے باہر چلی آتی، ہوا میں بس جاتی..... فضا مکدر ہوا ٹھنکی اور معطر بھی.....

اب بھادوں اسوج میں ڈھل رہا تھا جب کہ گرم ہوا اور لو کے عادی جسم سرد ہوا کا ایک بھی جھوٹکا برداشت نہیں کر سکتے۔ ایک عجیب طرح کی چیمن اور کاہش انسان کے دل کے اندر پیدا ہونے لگتی ہے نہ آدمی چادر اوڑھ سکتا ہے نہ چھوڑ سکتا ہے..... عورتیں کسی خیالی کچی سے اثر پذیر ہو کر سب گودڑ اور روئی اندر سے نکال لاتی ہیں اور پھر دھنیے کو بلوٹا اس سے دھنوا، نئے لفافوں میں بھرتی، ان پہ کالے سوت کے ”تگندے“ ڈالتی، لمبی تان کے سو جاتی ہیں..... سردیوں کے لیے تیار۔ اب ان کے لیے چاہے کھر پڑے یا برف لیکن

مردوں کو ٹھنڈی ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ ایک لذت ہوتی ہے ان کے جسم ایک دم سیاہ اور سرخ ہوا ٹھٹھتے ہیں اور مشام اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر مقابل کے مساموں سے ان گنت بار جفت ہونے کے لیے چل نکلتے ہیں..... مرد کا پورا جسم ایک بھینر سانپ کی طرح پھنکارنے لگتا ہے.....

منگل گھر کی طرف قدم اٹھانے ہی والا تھا کہ بائیں طرف چھت پر سے آواز آئی ”منگلاوے“

منگل نے اوپر دیکھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں ایشم کا چاند آکر رک گیا تھا..... سلا متی کھڑی تھی اور اس کے دھندلے سے نقش دکھائی دے رہے تھے۔ ایسے نقش جو اچھے بھلے آدمی کو پاگل بنا دیتے ہیں کیونکہ وہ پورے نظر نہیں آتے۔ سلا متی نے کہا ”ٹھہرو، مجھے تجھ سے کام ہے۔“

منگل..... جامد و ساکت رہ گیا۔ اس کے بدن میں اس وقت ایک ہی چیز حرکت کر رہی تھی..... اس کا دل، جس نے تمام تر سکوت کی کسر نکال دی..... سلا متی ادھر سے آرہی تھی جس طرف لکڑی کی سیڑھی جہلم کے گھر میں اترنے کی بجائے باہر اترتی تھی جس پر آزادانہ اتر چڑھ کر عنایتی اور سلا متی اور جہلم لال لال مرچیں سوکھنے کے لیے ڈالا کرتیں..... جتنا آدمی پوری زندگی میں کرتا ہے اتنا منگل نے سلا متی کے کوٹھے پر سے اپنے آپ تک پہنچنے میں سوچ ڈالا۔ سلا متی آکر منگل سے کچھ دور کھڑی ہو گئی..... چپ چاپ!

منگل نے پوچھا ”کیا بات ہے، سلا متی۔“

”کچھ نہیں“ سلا متی بولی..... اس کی آواز میں شکایتیں تھیں، حکایتیں تھیں اور آنسو تھے۔ گویا وہ کہہ رہی تھی ”تیرے سامنے بیٹھ کے روؤں گی لیکن دکھ تجھے نہیں بتاؤں گی۔“

”جتانا“ منگل نے کچھ آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

سلامتی تھوڑا پیچھے ہٹ گئی جیسے وہ ڈر گئی تھی.....

”پرے پرے“..... سلامتی بولی۔

..... ایک خوشبو اڑ کر سلامتی کی طرف سے آئی۔ یہ خوشبو گانوں کی خوشبوؤں

میں سے نہ تھی۔ کیونکہ ان خوشبوؤں میں سے منگل کے مشام پوری طرح سے واقف

تھے۔ یہ شہر کی خوشبوؤں میں سے تھی جو محبت کو ایک قسم کی گوارا سی غنونت دے دیتی ہیں

بخلاف اس پسینے اور غلاظت کی بدبو کے جو تندرست بدنوں کی ناتمام محبت اور اس کی تب و

تاب میں مندل ہو جاتی ہے..... منگل کے دل میں اواخر بھادوں کی ہواؤں سے جو

شعلہ ایسا لپکی بھڑک اٹھا تھا۔ اس ”پرے پرے“ سے اور بھی لپک اٹھا۔ سلامتی کے رکھ

رکھاؤ کی پروانہ کرتے ہوئے وہ آگے بڑھا اور بولا۔

”تو مجھ سے ڈرتی ہے؟“

”ہاں“ سلامتی بولی ”یاد نہیں اس دن.....؟“

”یاد ہے“ منگل بولا ”پر سب دن ایک سے تھوڑے ہوتے ہیں۔ سلامتی؟“ اور وہ

آگے بڑھ گیا۔ سلامتی پیچھے ہٹی ”نہیں نہیں نہیں نہیں“ کہتی ہوئی دیوار سے جا لگی۔ اس

نے سوچ رکھا تھا منگل کے ہاتھ پکڑتے ہی شور مچا دے گی اور اسے پکڑوا کر اپنی بے عزتی کا

بدلہ لے گی۔ ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا۔ اگر یہ پیچھے کا پیچہ، اس ایک جست کے

فاصلے کو، جو اس کے اور منگل کے بیچ رہ گیا تھا، پار کر کے اسے پکڑ لے اور اس کا منہ بند

کر لے یا منہ کو بالوں سے بھر پور چھاتی میں بھیج لے تو وہ کیا کرے گی؟ اس کی ساری منصوبہ

بندی دھری کی دھری رہ جائے گی..... اور وہ پیچھے، آہستہ مگر یقیناً اس کی طرف بڑھ رہا

تھا۔ سلامتی کی آواز گلے میں اٹک گئی..... وہ کانپ رہی تھی اور نہ جانتی تھی منگل پر بھی

کوئی لرزہ چھا رہا ہے۔ صرف ایک قدم..... اور سلامتی کے لیے اب سب کچھ ناممکن

الحاصل ہو گیا تھا۔ دونوں برابر آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کی آنکھوں کو تلاش کر رہے تھے دو باتوں کی طرح اندھیرے میں گھور رہے تھے..... ایسے میں صرف عورت کا دماغ کام کرتا ہے مرد کا نہیں۔ جیسے پھر مرد کا کرتا ہے عورت کا نہیں۔ اس ایک قدم کے فاصلے کو منگل کی بجائے سلامتی نے پاٹ لیا..... اور اچک کر منگل سے چمٹ گئی۔ اس نے من جانے کے انداز سے منگل کے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کا جارحانہ عمل روک لیا اور منگل ایک بیٹھی سی آواز میں بولا ”بولو کیا کام تھا؟“

”کچھ نہیں“ سلامتی بولی ”سوچا تھا ملے گا تو تجھ سے کہوں گی.....“ اڑیا جتنے تیرے ہل و گدے، اوتھے لے چل چر کھا میرا۔“ اور پھر وہ ہنس دی۔

منگل نے پھر ہاتھ آگے بڑھائے۔ سلامتی بولی ”پاگل ہو گیا ہے..... یہ بھی کوئی وقت ہے، جگہ ہے؟“
”نہیں نہیں۔“
”نہیں“

”تو پھر..... کب؟..... کہاں.....؟“

سلامتی نے اکیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”وہاں..... جب ادھر مندر میں گشتیاں بچیں اور مسجد میں ملا اذان دے.....“

منگل نے پہلے اکیہ کی طرف دیکھا اور پھر آسمان کی طرف جہاں اتر چکھم میں کچھ پھوئیں پھوئیں سے بادل جمع تھے۔ پھر سلامتی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”ہاں ٹھیک ہے..... کل ہزاری نے وہاں سے شراب کا مٹکا نکالا تھا“ اور اس نے اکیہ کی طرف اشارہ کیا ”بس مٹکے دو مٹکے جتنی ہی جگہ ہے“ اور پھر اس نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا مگر اس کے پھڑکتے ہوئے ہاتھوں کو یقین نہ آرہا تھا، ان کے قابو میں کیا چیز آئی اور کیا نکل گئی۔ اس نے

اپنے آپ میں ہمت کی بھی کمی پائی اور سوچا..... آج دو گھونٹ شراب تیزاب کے اندر ہوتے تو مزہ آجاتا اور پھر دن بھر لکے اور دھول کے بعد اسے اپنا آپ کچھ گندہ بھی لگ رہا تھا۔ منہ سے ماں بہن کی گالیوں کی بو آرہی تھی۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے وہ بولا ”اچھا سلامتی، بھولنا نہیں.....“

”میں نہیں، تو ہی بھول جائے گا۔“ سلامتی منگل کی نگاہوں کا شک دور کرتے ہوئے بولی۔

”نہیں“ منگل نے کہا۔

..... اور آدھے چاند کی رات میں منگل سلامتی کی نظروں کو دلتا ہوا چلا گیا۔ بدن میں ایک ایسا ایک تناؤ سا پیدا ہو جانے کی وجہ سے اس کی چال ہی بدل گئی۔ ریڑھ کی ہڈی میں کوئی سانپ لہراتا بند ہو گیا تھا اور چیخے سے دیکھنے پہ وہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے انسان نہیں، کوئی لٹھ جارہا ہے۔

سلامتی وہیں کھڑی کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ اسے بھی بھادوں کے جھونکے لگے تھے اور اس کا بدن ہوا میں پڑے سلگتے ہوئے کوئلے کی طرح کبھی بھڑک اٹھتا اور کبھی بجھ جاتا۔ یوں معلوم ہونے لگا تھا جیسے آدھی رات کے وقت جب منگل آئے گا تو سلامتی شور مچانے، اسے پکڑوانے، پٹوادینے کے منصوبہ کو عمل میں نہیں لائے گی..... گھر کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے اس نے اپنا تہ بند کسا کہ سامنے سے عنایتی، سلامتی کی بڑی بہن آگئی۔

”تو کہاں سے..... آپاں؟“ سلامتی بولی۔

”شرمادائی کے ہاں سے..... جو شانندہ لے کر آئی ہوں۔“

”جو شانندہ؟“..... وہ کس لیے؟“

”مرنے کے لیے۔“ عنایتی نے بیزار سے کہا۔

سلامتی کچھ نہ سمجھی۔ عنایتی نے کچھ شرماتے، کچھ مسکراتے ہوئے کہا۔ ”عورت ہونا بھی ایک ہی لعنت ہے“.....

”ہوہائے!“ سلامتی نے کچھ پتاپتے ہوئے کہا ”روڈا چکی پٹا تو ابھی سال بھر کا بھی نہیں ہوا.....؟“

”اسی لیے تو..... یہ مر رہی ہوں“ عنایتی نے کاڑھے کی بڑی سی پڑیا کو ماتھے کے ساتھ مارتے ہوئے کہا۔ پھر دونوں مل کر گھر کی طرف چل دیں۔ سلامتی بولی ”یہ سب کرنے سے پہلے تم نے مراد سے پوچھ لیا؟“

..... مراد عنایتی کے میاں کا نام تھا۔

”آنہہ!“ عنایتی نے اپنی بانہہ جھٹکتے ہوئے کہا ”اس نام مراد سے پوچھنے بیٹھتی تو ابھی تک گیارہ ہوتے..... میرا پیٹ ہے کہ ملوک سنگھ کا آنا.....؟“

سلامتی کو جھر جھری سی آئی وہ الھڑ بہت کچھ نہ جانتی تھی لیکن کائنات میں مادہ تھی جس کے رحم ہوتا ہے..... وضع حمل اور تولید کے نام ہی سے جس کے اندر ایک نامحسوس سی کسمساہٹ دوڑ جاتی ہے۔ سلامتی نے کہیں دور کی بات سوچی۔ آخر یہ ہوتا ہے؟..... یہی ہوتا ہے تو پھر؟..... جب تک عنایتی دروازے کے اندر پیر رکھنے جا رہی تھی۔ سامنے اس نے مراد، اپنے میاں کو اپنی سالی عائشہ سے چھیڑ چھاڑ کرتے دیکھا اور اُلٹے پانویا ہر آکر سلامتی سے بولی۔ ”ایسے! پھر ملا تجھے وہ بھائیہ لڑکا؟“

”کون؟“ سلامتی نے کہا..... حالانکہ جانتی تھی عنایتی کہاں مار کر رہی ہے۔

”ارے وہی، اے کے والا..... منگلو؟“

سلامتی نے جب تک سوچ لیا..... ”نہیں“ وہ بولی.....

اس کے بعد اندر جا کر عنایتی عائشہ، روڈے، مراد وغیرہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جہلم پھر ترکاری کے بدلے، صبح گوشت میں ڈالنے کے لیے چنے کی دال لینے گئی تھی.....

ابے کا ہمیشہ کی طرح کچھ پتہ نہ تھا..... سلامتی ایک کھاٹ پر بیٹھ کر سوچنے لگی۔ اس دن کا دہاڑنے والا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور وہ شرم اور خجالت سے لال ہوا ٹھکی نہ جانے کیا ہو گیا مجھے! ایسے بھی کوئی ماننا چلا جاتا ہے کسی کی بات؟ وہ کہتا..... اتار دے اور بھی کچھ تو میں وہ بھی اتار دیتی..... پاگل! کیسے پھر گلی میں آکر کرتا پہنا اور اپنے یہ دوزخی چھپائے..... اللہ! کوئی دیکھ لیتا تو.....؟

کچھ ہی دیر میں سلامتی، ابلنے کھولنے لگی..... بولا..... ہو گئی سیر، چلی جا اب..... اور مجھے جانا پڑا۔ اتنی بے عزتی نہ ہوئی ہوگی کسی ماں کی، بیٹی کی۔ پر جس چیز کو آپاں بے عزتی کہتی ہے، میں اسے بے عزتی نہیں کہتی..... پھر وہ اٹھی اور ہانڈی لے کر سب کو کھلانے پلانے کے بہانے عنایتی کے پاس چلی گئی اور جب سب جنے تھوڑے ادھر ادھر ہوئے تو اس نے عنایتی کو منگل سے اپنی ملاقات کا واقعہ بتا دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ وہ ملنے آئے گا مدرسے کے باہر اکیچ میں.....

تھوڑی ہی دیر بعد مراد، گانو کے دو چار بد معاشوں کو لے آیا۔ اپنی غریبی، اپنے افلاس کے باوجود وہ یہ برداشت نہ کر سکتے تھے کہ ایک کافر کسی مسلمان لڑکی کی عزت پہ ہاتھ ڈالے..... سب نے مل کر جلدی جلدی لاٹھیاں، چھریا اور گنڈا سے جمع کر لیے..... اور پھر بیٹھ کر، برسوں پہلے کے جاترن اور تلو کے قتل کی باتیں کرنے لگے.....

ایک چادر میلی سی

(۸)

منگل نہاد ہو چکا تھا اور اب اپنی داڑھی کو کچی گھانی کا تیل لگا رہا تھا۔ صبح جب خیرے نے پڑے میں سرسوں ڈالی تو پہلی چند بوندیں بوتل میں منگل نے لے لی تھیں..... نصیبوں والے اڈے سے لوٹ کر، سلامتی سے ملنے کے بعد منگل چھوٹے سے کھیلابھی، بڑی کی چوٹی بھی کھینچی اور ماں جنداں سے بڑی کے لیے ”بابو“ دیکھنے کی باتیں بھی کیں..... اور پورا گھر جھک اٹھا.....

’ آج رانو اسے اچھی لگ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے اس کی شادی کو دو چار سال ہی ہوئے ہیں اور وہ بچے اس کی بڑی سوت کے ہیں۔ یادہ بڑا بھائی ہے اور چھوٹے بھائی کے قتل ہو جانے پر، اس نے اس کی بیوی پہ چادر ڈال لی ہے..... نہیں نہیں، یہ نہیں ہوتا۔ چادر چھوٹا بھائی ہی ڈالتا ہے۔ بڑے بھائی کے لیے چھوٹے کی بیوی، بہو بیٹی کی طرح ہوتی ہے۔‘

چونکہ منگل خود، معمول کے خلاف، آج شام کو نہاد ہو کر صاف ستھرا ہوا تھا اس لیے رانو اسے غلط سمجھ گئی تھی..... وہ سمجھی یہ سب میرے لیے ہے، آج کا دن میرا تھا، رات بھی میری ہے..... رانو کو دیکھ کر منگل سمجھا یہ اس کی آنکھوں کا قصور ہے لیکن نہیں..... آج رانو اپنی ہی آنکھوں، اپنے ہی دل، اپنے ہی گالوں..... ہونٹوں، کو لھوں، رانوں کا قصور تھی۔ آج صبح جب وہ ”نہا کر جو ہڑ میں سے نکلی تو سٹلے کی لاٹ معلوم ہو رہی تھی۔“ پھر اس نے گھر پہنچ کر دن میں کئی بار ابٹنا مل کر جلد کو اتنی نرم اور چکنی بنا لیا تھا کہ

اس پر سے نگاہیں اور جذبے پھسل پھسل جاتے تھے اور پھر وہیں پڑے پھل پھل جاتے اور اس وقت تک الگ نہ ہوتے جب تک کوئی ان کا ہاتھ پکڑ کر نہ اٹھائے..... پھر اس نے بندی لگا رکھی تھی۔ کوئی غور سے دیکھتا تو پتا چلتا آج ہو صرف بندی نہ تھی وہ صبح کا سورج تھی جو گہرا سرخ ہوتا ہے اور تیز تیز اپنے محور کے گرد گھومتا جاتا ہے پھر ایک ایک جیسے کرنوں کے انبار میں ہاتھ ڈال کر کسی نے چھپھلا دیا..... اخروٹ کی چھال کا رنگ ہو نٹوں پر چلا آیا اور اب تک کے سوکھے ہوئے چھوہاروں کی بجائے وہ رس بھریوں کے ڈھیر معلوم ہونے لگے..... منگل نے ایک بار پھر ذرا غور سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

”تو آج با جا ر گئی تھی؟“

رانو نے ایک اچھتی ہوئی نظر منگل پہ ڈالی اور پھر اسے اپنی طرف یوں دیکھتے پا کر نگاہیں چرائیں اوزد لھنوں کی سی دھیمی آواز میں بولی ”ہاں“ اور پھر کام کاج کے بہانے، اپنا آپ ادھر ادھر چھپانے، وقت بتانے لگی۔

رانو کیا چھپا رہی تھی؟ یہ بات نہیں کہ وہ سکھڑ سیانیوں کی طرح اپنا سارا کچھ ایک ہی دم نہ دے دینا چاہتی تھی بلکہ کوئی بات تھی جو ابٹنے، بندی، اخروٹ کی چھال اور رس بھریوں سے اوپر ہوتی ہے جس کا تعلق عورت کی شکل و صورت سے نہیں ہوتا، نہ اس کی نسائیت اور اس کی انتہا سے..... جسے وہ دھیرے دھیرے سامنے لاتی ہے اور جب لاتی ہے تب پتا چلتا ہے..... یہ بات تھی! جیسے اشٹم کا چاند اپنا آدھا چھپائے رہتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ، روز بروز، ایک ایک پردے..... دوپٹے چولی، انگلیا، سب کو الگ ڈال جاتا ہے اور آخر ایک دن، ایک رات پورنیا کے روپ میں آکر کیسی بے خودی و مجبوری، کیسی ناداری اور لا چاری کے ساتھ اپنا سب کچھ لٹا دیتا ہے..... کیا علم النساء، علم النجوم سے دور کی بات ہے؟ کوئی بھی علم دوسرے علم سے فاصلہ رکھتا ہے؟..... جن لوگوں نے برسوں اور عادتاً آسمانوں پہ جھانکا، ستاروں کو دیکھا ہو، ان کی جھل میل کے ساتھ

مرے بل بل کے ساتھ جئے ہوں اماوس کے ساتھ مر جھائے، پونم کے ساتھ کھلے ہو۔
وہی رجنی کی آنکھوں میں پلکوں کے نیچے، زمینوں سے بڑی آسمانوں سے بڑی، برق و مقنا
طیس کی وسعتوں میں جو اس رچائی جاتی ہے، جو بھنگڑے اور جھمر اور لڈی مانچے جاتے ہیں
، ان کے راز سمجھتے ہیں..... وہی اشٹم کے چاند کا بھید بھی جانتے ہیں.....

منگل اسکے والا، پھر سلامت میں بے سلامت ہو کر اس گھر کی اشٹم کا بھید کیسے
سمجھتا؟ اس نے کبھی آسمانوں پہ جھانکا ہی نہ تھا۔ وہ تو یہ بھی نہ جانتا تھا وہ خود ایک ستارہ ہے
..... سورج جو کبھی کسی کو اپنی طرف دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا جو دیکھتا ہے اندھا ہو جاتا
ہے اس کے طلوع و غروب، اس کے توازن و اعتدال، شب و روز آپس میں سر ٹکراتے، مر
جاتے، سلف کا حصہ ہو جاتے ہیں..... بنات اللعش اس کی طرف دیکھتی ہوئی معدوم
چاند..... بے نور، کاغذی ہو کر گھٹا گھٹا گھٹ جاتا ہے اور آخر عدم کی پہنائیوں میں گم ہو
جاتا ہے اور وہ..... سورج..... بے خبر.....

لیکن آج..... اس بے خبر سے منگل کو رانو کچھ خبریں دینا چاہتی تھی۔ وہ اس
گھونگھٹ کو اٹھا دینا چاہتی تھی جو منگل اور اس کے بیچ حائل ہو رہا تھا۔

گھنڈا انھیاں کرے سو جا کھیاں نوں

گھنڈا لاہ منہ اتوں لاڑیے نی

وارث شاہ نہ دیتے مرتیاں نوں

مُھل اک دے دج نہ ساڑیے نی

گھونگھٹ دیکھنے والوں کو اندھا کر دیتا ہے۔ اے دلہن تو اسے مکھڑے

پر سے ہٹا دے وارث شاہ! موتیوں کو دفنا کر نہیں دیکھتے۔ نہ پھولوں کو آگ میں جلاتے ہیں

..... اور آج رانو نے اس پردے اور حجاب کو دور کر دینے کی ٹھان رکھی تھی جسے بیچ سے

ہٹائے بغیر خدا بھی نہیں ملتا۔

اُدھر منگل آج جیسے کوئی رشوت ڈینا چاہتا تھا۔ اس نے کرتے کی جیب سے رانو
کے لیے بالوں کی کچھ سوئیاں نکالیں۔ لوٹتے ہوئے جنھیں وہ قصبے سے لے آیا تھا۔ انھیں ہاتھ

ہیں لیتے ہی رانی چوٹ اٹھی۔ اس کے منہ سے ایک بے خودی کے عالم میں ہانکی.....
عورت میں لذت کی انتہا، لیکن منگل کہیں دور دیکھ رہا تھا..... پھر لوٹ کر اس نے پیسے
نکالے اور رانو کے ہاتھ میں تھما دیے..... رانو کی آنکھوں میں آنسو اٹھ آئے لیکن اس
نے حیران ہو کر پوچھ ہی لیا۔

”یہ آٹھ روپے..... کہاں سے آگئے؟“

”آج پسرور کی سو رانی لگی تھی۔“

”تو.....؟“

تو کیا؟..... کھاؤ، خرچو۔“ اور پھر پہلی بار، اپنی بیاہتا زندگی میں پہلی بار اس نے

معنی خیز نگاہوں سے رانو کے سنگھار کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”خرچ بھی تو بڑھ گیا ہے۔“

اور رانو پہلی بار، اپنی نئی بیاہتا زندگی میں پہلی بار ایک بیوی کی طرح شرمائی اور اسے

یوں محسوس ہوا جیسے اس کا ابٹنا، اس کی منہدی، اخروٹ کی چھال اور رس بھریاں سی

ہو گئیں۔ اس نے ٹمنے کے پردے سے اپنا سب کچھ ایک بار ڈھک لیا وہ منگل کے قریب

ہونے میں کتنی دور اور دور ہونے میں کتنی قریب ہو ہو جاتی تھی۔ پھر اس نے بھی سوچا

..... ابھی نہیں۔ ابھی تو مندر میں گھنٹیاں بھی نہیں بجیں۔ مسجد میں ملانے اذان نہیں

دی.....

منگل نے کہا..... ”کھانا نکال دے جھٹ سے۔“

”ابھی نہیں۔“

”کیوں؟..... ابھی کیا ہے؟“

رانو کچھ گھبرا سی گئی۔ وہ اس سوال کا جواب نہ دے سکی لیکن منگل نے خود ہی ایک

انجام پینے میں اسے اس دبا سے نکال لیا..... ”کیا کوئی بہت چھی چیز پکی ہے؟“

”ہاں“ رانو نے کہا۔ اور پھر کھٹے سے اس کے دوپٹے میں کوئی تو تبا بولنے لگا۔ ”پنہ

کی دال پکائی ہے۔ ساتھ پودینے کی چٹنی۔ کراری مسالوں والی۔“
 کتنی بھول ہوئی! منگل کو سب یاد آگیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے نتھنے پھولنے
 لگے اور بال جیسے اپنے آپ پگڑی سے باہر آگئے۔ اگر بالوں میں نہیں تو خیالوں میں ضرور
 اس دن والی من چھٹیاں، آگ کی بڑھی مائیاں اڑی ہوئی تھیں وہ ایک دم خفا ہو کر بولا۔ ”دو
 جو بھی پکا ہے نہیں میں جانتا ہوں، ضروری کام ہے۔“

رانو سنبھلتے سنبھلتے پھر گرسی گئی۔ اس نے کچھ اور ہی سوچا تھا اور ہی پکایا تھا.....
 شاید کوئی ایسی ویسی بات نہ بھی ہو..... اچھا ہی ہے، جب لوٹے گا بچے سوچکے ہوں گے۔
 سر کی کھوں کھوں، کھانہ کھانہ ساس کے شروع رات کے خراٹے بند ہو چکے ہوں
 گے۔ ایسی خاموشی ہوگی کہ سانس بھی روکنے پڑیں گے۔ ایک ایسی منگل نے کہا۔

”میری وہ کرتی کہاں ہے؟“

”رانو سمجھ گئی..... سننا گئی۔“

”کہاں جا رہا ہے؟“ اس کے منہ سے بے اختیار نکل آیا ”دیکھتے نہیں بادل گھرے
 ہیں.....؟“

”ہوں گے“ منگل نے کہا۔ ”تو کون ہے روکنے والی؟“

رانو بے بضاعت سی ہو کر رہ گئی۔ بولی ”نہیں، میں تو کوئی نہیں..... ایسے ہی

پوچھا تھا.....“

اگر رانی اڑ جاتی..... جیسے تلو کے کے ساتھ اڑ جاتی تھی اور کہتی ”میں نہ روکوں
 گی تو اور کون روکے گا؟“ تو منگل الف ہو جاتا لیکن وہ اپنی پھٹی ہوئی میلی بوسیدہ سی چادر کے
 رشتے کو سمجھتی تھی۔ منگل رانی کے اس مریل سے جواب سے کچھ ڈھیلا ہو گیا اور بات کو ختم
 کرنے کے اندر بولا ”جا رہا ہوں رنڈی کے ہاں.....“

یہ فقرہ شوہر عموماً اس وقت کہتے ہیں جب وہ واقعی رنڈی کے ہاں جا رہے ہوں اور

بیویاں سمجھتی ہیں ان کامیاں کسی غلط جگہ نہیں جا رہا۔ ورنہ وہ ایسے کہتا؟ لیکن رانو کو حالات میں ہر لمحہ پیلا ہو جانے والے خطرے نے ایک ایسی سمجھ دے دی تھی جو اس کی دوسری بہنوں کے حصے میں نہیں آئی تھی۔ ایک ایسی وہ دیوی سے ایک عام گوشت پوست کی عورت بن گئی۔ ایک دم چالاک اور عیار..... حرافہ! کیا کرتی؟ وہ مجبور تھی اور بے بس۔ آدمی پل پل حالات اور واقعات سے اثر پذیر ہوتا ہے، ان کے ساتھ بدلتا ہے، ورنہ پر ماتمانے اسے اتنا بڑا نسوں کا جال نہ دیا ہوتا۔

کرتی کے مطالبے نے رانو کے شک کو یقین میں بدل دیا۔ وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے بھی نتھنے پھولنے لگے جو منگل کو رانی کے دوپٹے میں دکھائی نہ دیے۔ ایک بیوی کے مقابلے کے لیے اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے، ایک بیسوا کی سطح پر اتر آئی تھی۔ اپنی نگاہوں کے افق پہ اسے سلامتی کا بدن لہراتا ہوا نظر آیا۔ جس کے بدن کے کسے کسائے اور مناسب اعضا میں متقابل کے لیے قدرتی جگہیں بنی تھیں۔ جس کے جسم کی تازگی اور شادابی کو ابٹنے اور بندی اور اخروٹ کی چھال کی ضرورت نہ تھی..... جو سب چیزیں منگل سے استھول، پتھر آدمی کے لیے بے کار تھیں جو خود چٹان تھا، چٹانوں سے بھڑنا چاہتا تھا، خود لوہا تھا، لوہے سے ٹکرانا چاہتا تھا..... اور رانو جانتی تھی اور اس کے لیے تیار تھی..... اس نے ایک اڑی نظر سے ٹرک کی طرف اشارہ کیا اور بولی.....

”وہاں پڑی ہے تیری کرتی۔“

جب ہی باہر سے ودیا کی آواز آئی..... ”رانو“

رانو ایک دم باہر لپکی اور اس سے پہلے کہ ودیا کچھ کہتی..... رانو نے اسے باہر

دھکیلتے ہوئے کہا..... ”چلی جا..... ودو..... اس وقت چلی جا“

ودیا نے بے کاری ضد کرتے ہوئے کہا..... ”کیوں نی؟“

رانو ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی ”پر ماتما کے لیے..... بڑے بڑو توں کے لیے.....“

اور وڈیا حیرانی سے پیچھے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔

رانو اندر آئی تو منگل ٹرنک کھول چکا تھا۔ اس نے کچھ کپڑے ادھر ادھر بکھیر رکھے تھے۔ اس کے ہاتھ میں مٹھے مالے کی بوتل تھی اور آنکھوں میں چمک۔

”یہ کہاں سے آئی؟“ اس نے رانو سے پوچھا۔

”یہ کیا؟“

یہ..... ”منگل نے بوتل کو ہوا میں اٹھاتے ہوئے کہا ”مٹھے مالے کی بوتل!“

رانو نے کچھ لرزتے، کچھ باہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”مجھے کیا معلوم؟“ اور اسے

بہت کچھ اپنا چھپانے کی ضرورت بھی نہ پڑی۔ ڈیو رو نے لگا تھا..... رانو نے آدمی اندر

آدمی باہر جا کر بانہہ الارنی شروع کر دی تھی..... ”ہات، ہات موئے!..... یہاں

دھر کیا ہے، تیرے رونے کو.....؟ روان کے ہاں جا کر، جن کے ہاں ترکاری ملتی ہے،

کوس ملتا ہے.....“ اور پھر مڑ کر بولی ”تیرا بھائی پیا کرتا تھا.....“

”ہاں مگر“ منگل نے حیرانی سے کہا ”اتنے برسوں سے.....؟“

”پڑی رہی ہوگی..... میں نے تو جب سے اس ٹرنک کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔“

منگل بوتل کھما کھما کر دیکھ رہا تھا جیسے یقین نہ آرہا ہو..... بالکل وہی شراب تیز

اب جس کی اس شام اسے طلب تھی جس سے اس نے چاہا تھا کہ اس کی ہمت بڑھے چیتے کی

سی لپک آجائے، دس گھوڑوں کی سی طاقت..... اسے بھی اپنے ذہنی افق پر ایک ترو

تازہ، تندرست و توانا لڑکی دکھائی دی، اس نے تھوڑا اندر باہر ہو کر اوپر، آسمان کی طرف

دیکھا اب بادل گھر آئے تھے اور چاند کو اپنے لحاف و توشک میں چھپا لیا تھا۔

ضرور کہیں گرمی پڑی ہوگی، بخارات اٹھے ہوں گے جو اس مہینے بھادوں کے آخر

میں کوٹلے کے اوپر چھا گئے..... شاید کہیں رات اور دن برابر ہونے والے تھے

..... بادلوں کے بیچ میں سے اپنا گریبان پھاڑ کر دیکھتے ہوئے ستاروں سے اس بات کی

تسلی کر کے کہ ابھی پہلا ہی پھر شروع ہے، منگل لوٹ آیا لیکن لوٹنے کے بعد وہ پہلا سا منگل نہ رہا تھا۔ ایک عجیب قسم کی کرفنگلی اس کی نگاہوں میں چلی آئی تھی۔
میں کبھی کبھی..... وہاں نصیبوں والے اڈے پر لگا لیتا ہوں۔ ”وہ انگوٹھا اور مٹھی منہ کی طرف لے جاتے ہوئے بولا۔

”میں جانتی ہوں۔“ رانو نے کہا۔

منگل نے پروانہ کی، نہ کسی استعجاب کا مظاہرہ..... پھر اس نے بوتل کی طرف دیکھا۔ حرص و آرزو نے بہت کچھ اسے دیکھنے نہ دیا۔ مثلاً رانو کی آنکھوں میں اٹل آنے والا سیل ساتھ ہی اس کا تیز ہوتا ہوا تنفس۔

”تیرے سامنے تو نہ پیوں گا“ وہ اپنی ہی رٹ لگاتے ہوئے بولا۔

رانو چوکنی ہوئی..... ”کیوں؟“

تو برامانتی ہے نا؟“

برانو کے چہرے پر کئی..... نہیں، میں کیوں برامانوں گی؟ میرا حق ہی کیا ہے؟“
کسی نے اسے روک دیا۔ اس کی نگاہیں پھر ایک حرافہ کی نگاہیں ہو گئیں اور وہ بولی ”ہاں، تو جانتا ہی ہے، مجھے زہر لگتی ہے۔“

پھر جیسا کہ رانو کا اندازہ تھا۔ جیسا کہ وہ منگل کو جانتی تھی۔ جیسا کہ وہ چاہتی تھی..... منگل ایک دم بھٹا اٹھا۔ ایک دم بوتل کے گلے میں مٹھی گھماتے ہوئے اس نے کاگ کو ڈھیلا کر دیا پہلے چوروں اور پھر ڈاکوؤں کے انداز میں بولا ”یہی ہے ماتم عورتوں کی بات..... کھانے پینے سے بھی روکتی ہوا اپنے مردوں کو۔“ اور وہ جھینپ گیا۔

رانو خوش ہوئی۔ زبانی ہی سہی مگر۔ عورت ”مرد“ کا رشتہ تو قائم ہوا۔ اوپر سے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے بولی ”خبردار، میں نہ پینے دوں گی۔“

بالکل جیسا کہ رانو نے سوچا تھا۔ منگل نے کاگ ڈال کر باہر پھینک دیا۔ بوسی نکلی

اور سارے کمرے میں پھیل گئی۔ رانو نے ایک ہاتھ سے دوپٹہ ناک کے سامنے کر لیا اور دوسرا ہاتھ منگل کے ہاتھ اور بوتل کے منہ پر رکھ دیا۔ منگل نے رانو کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا..... ”میں پیوں گا..... ضرور پیوں گا۔“

’تو نے اپنے بھائی کو ہٹکایا تھا..... بوتل توڑی تھی، مجھے چھڑایا تھا۔‘
 ”وہ..... وہ تو مجھ پر ترس کھایا تھا۔“

پھر..... جیسا کہ رانو نے سوچا تھا۔ منگل نے اس کے ہاتھ جھٹکنے شروع کر دیے بیچ میں بڑی آگئی۔ اور دونوں کو ایک دوسرے کے اتنا قریب پا کر ٹھٹک گئی..... جب ہی باہر سے بادل کی گرج سنائی دی ”جاتو“ رانو اسے دیکھ کر بولی ”کھانا کھلا دے، سلا دے سب کو اندر، پانی پڑنے والا ہے۔“ بڑی نے باہر جاتے ہی اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ آج وہ صبح ہی سے ماں کے تیور دیکھ رہی تھی اور کچھ کچھ سمجھ بھی رہی تھی۔

رانو پھر بوتل پر جھپٹنے لگی اور منگل اسے دھکیلنے لگا۔ اس کے سخت اور کھردرے ہاتھ، رانو کے بدن کے ہر حصے کو لگ رہے تھے۔ بیچ میں اس نے کچھ رکھ رکھاؤ کیا بھی لیکن چادر کا بیچ نامہ تھا جو راون کا بدن توڑ رہا تھا۔ وہ بار بار ایک دم بوتل سے منہ لگا کر پیتے ہوئے، ہانپتے ہوئے کہہ رہا تھا ”میں اپنے بھائی کی طرح نامرد نہیں جو ایک عورت کے سامنے ہتھیار ڈال دے گا۔“

منگل نے اس چھینا جھپٹی میں ایک تہائی بوتل خالی کر دی۔ رانو کچھ اور لپکی۔ منگل نے اب اسے نیچے فرش پر گرا دیا اور پھر جوش کے عالم میں اسے زد و کوب کرنے لگا..... بالکل ایسے ہی جیسے رانو نے سوچا تھا..... وہ اوپر اٹھنے کی کوشش کرنے لگی اور منگل اسے نیچے دبانے کی۔ بیچ میں ایک ہاتھ سے بوتل اٹھا کر وہ پھر پی گیا..... ہو لے ہو لے اس کا چہرہ لال ہونے لگا۔ خون کانوں اور سر کی طرف آنے لگا۔ رانو کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ اس کے اعضا میں ایک ایسی تڑپ پیدا ہو گئی جسے زیر کرنا مشکل

ہو گیا..... ناممکن..... اب کے جو رانی اٹھی تو منگل نے اسے دیوار کے ساتھ دے مارا.....

خون کا ایک فوارہ رانو کے سر سے چھوٹا اور اس کی ٹانگیں اسے سنبھالنے کے قابل نہ رہیں۔ وہ زمین پر پڑی تھی..... آنکھیں بند اور منہ کھلا ہوا..... رانو کی خاموش بغاوت کے باوجود آواز جنداں تک پہنچ گئی اور وہ بولی۔

”کیا ہے بہو؟“

ایک عجیب قسم کی لذت سے بے ہوش ہوتے ہوئے رانو نے جواب دیا ”کچھ نہیں بتائی، بتی ہے!“..... اور پھر اس پر ایک غنودگی سی چھانے لگی۔ بدن کے اعضا ڈھیلے پڑ گئے جہاں ہاتھ پڑا تھا، ٹانگ پر پڑی تھی اور جہاں کپڑا پڑا تھا، کپڑا..... نیچے شراب گری تھی یا پانی..... رانو کی سلوار تریتر ہو رہی تھی۔ اب تک جو کچھ ہوا اس سے یہ نہ معلوم ہوتا تھا دونوں میں سے کس نے پی ہے؟ نشہ کسے آیا ہے؟..... کس کا اتر ہے؟..... منگل رانو کے پاس حیران کھڑا تھا۔ عجیب عورت ہے! اتنی مار پڑی اس پر بھی کہہ دیا..... بتی ہے!..... وہ شرمسار تھا اور شکر گزار بھی۔

چکڑی پھاڑ کر اس نے رانو کے زخم پونچھنے شروع کر دیے اور پھر کپڑے کو منھی میں رکھ کر اس پر سانس کی دھونکنی چلانے لگا۔ رانو کے بدن پہ جہاں جہاں سوجن تھی۔ لگانے لگا۔ ویسے ہی جیسے اس رات رانی نے کیا تھا..... رانی کو آرام آرہا تھا۔ حظ آرہا تھا اور منگل کو رونا، اور اس رونے میں کفارے کی تسکین روتے روتے اس نے رانی کے پانو پکڑ لیے۔ اب وہ اسے اوپر کھینچ رہی تھی، اس کا بدن سہلا رہی تھی..... جیسے مارا سے نہیں منگل کو پڑی ہے۔

”معاف کر دے، مجھے معاف کر دے۔“ منگل رٹ لگائے جا رہا تھا۔

وعدہ کر، پھر نہ ہے گا ”رانو نے اس کے ساتھ لگتے ہوئے کہا اور پھر ایک دم کسی

خطرے سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے پیش قدمی کرتے ہوئے بولی ”وعدہ کرے گا تو میں..... آج تجھے اپنے ہاتھ سے پلاؤں گی۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں“ منگل نے کہا اور پھر سوچنے لگا، اس نے کس بات کا وعدہ کیا ہے؟..... رانو آہستہ سے اٹھی اور باہر چلی گئی۔ منگل بیٹھا برتنوں پر بارش کی جلت رنگ سن رہا تھا۔ بڑی نے سب کو کھلا پلا دیا تھا اور کہیں دور، اندر سلا دیا تھا جیسے، ہمیشہ کے لیے..... جیسے انسان اور قدرت کے درمیان اس عظیم سازش میں وہ بھی شریک ہو گئی تھی..... رانو نے تنور کو برسات سے بچانے کے لیے اس پر ایک بڑا سادا بڑرکھ دیا اور پھر کھانا لے کر اندر چل دی۔

رانو لوٹی۔ تھالی میں ایک طرف روٹی پڑی تھی اور دوسری طرف کچھ پیاز اور..... چانپیں! منگل نے حیران ہو کر چانپوں کی طرف دیکھا اور پھر رانی کی طرف اور اس کے منہ میں پانی آنے لگا۔ رانو نے گلاس میں ایک دم بہت سی شراب انڈیل دی اور منگل کے ہاتھوں میں تھما دی۔ منگل کو جیسے یقین نہ آرہا تھا۔ کھانے سے نظریں ہٹا کر اس نے رانی کی طرف دیکھا جس کی نگاہیں پیالے بنی ہوئی تھیں۔ پھر وہ انکار نہ کر سکا۔ گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا۔

”آج کے بعد پیوں تو سمجھو..... گائے کھاؤں؟“

اس نے گلاس منہ کی طرف اٹھایا تو رانو نے روک دیا ”ٹھہرو“..... جیسے اسے کوئی بات یاد آگئی۔ وہ باہر گئی اور تھوڑی دیر کے بعد لوٹی تو ہاتھ میں ایک ٹوٹی ہوئی چینی کی رکابی تھی اور اس میں دل کی شکل کا ایک ٹماٹر..... جو آٹھ حصوں میں کٹا پڑا تھا۔

منگل پینے اور کھانے لگا۔ رانو رو رہی تھی..... ایسا مزہ منگل کو نصیبوں والے اڈے پہ کہاں آیا تھا؟ روتے کانپتے ہوئے رانو نے اور انڈیلی..... اور..... اور..... اور شراب رانی کو چڑھ گئی..... رانی کو! چھینے کے بجائے وہ کھلنے لگی۔ پہلے جالی کا دوپٹہ جیسے

اتفاق سے گر گیا۔ پھر کرتے کے تکتے کھل گئے جب ہی مندر کے گھنٹے سنائی دیے، پھر مسجد سے اذان۔

”ہات!“ منگل نے گھنٹے اور اذان سنتے ہوئے کہا.....

”ہات کیا؟“ رانو پوچھنے لگی۔

”یہ“ منگل نے اپنا عمر یقینی ہاتھ جہلم ارا عین کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا ”یہ ملا اور

پنڈت۔“

اور اس نے اٹھنے کی کوشش کی، دروازے تک گیا بھی لیکن باہر گھپ اندھیرا دیکھ کر، لڑکھڑاتا ہوا اپنی جگہ پہ آ رہا۔ پھر ایک ایک اپنی آنکھوں پر پورا زور ڈالتے ہوئے وہ سامنے دیکھنے لگا..... رانی کھڑی تھی۔ پونم کا چاند!..... جو بے صبر ہو کر آدھے سے پورا

ہو گیا تھا اور بادلوں کے لحاف و توشک کو چیرتے، پھاڑتے ہوئے، نیچے مزین پر اتر آیا تھا۔ منگل اٹھ کھڑا ہوا اور سانس روک کر دیکھنے لگا۔ بہ مشکل تمام بولا۔ ”تم..... تم نے کپڑے کیوں پہنے ہیں؟“

رانو نے اپنا پھٹا پرانا جالی کا دوپٹہ اٹھایا اور اسے اپنے اور منگل کے بیچ تانتے ہوئے بولی ”لو اتار دیے“ اور دوپٹے کو دو اٹھے ہوئے ہاتھوں میں تھامے، رانو پہلو کی طرف مڑی..... عورت کا حسن تلاش منگل کے سامنے تھا جس سے گیسوں کی روٹی کھانے والا کوئی بھی مرد انکار نہیں کر سکا..... اور بیچ میں لطیف سا پردہ..... پھر، اس حسن پر ایک انگڑائی، ٹوٹی..... سال کے، دن ہفتے، ہفتے کے سات دن، دن کے آٹھ پہروں، گھنٹوں اور پلوں میں ایک ایسا لمحہ ضرور آتا ہے جب چاند لپک کر سورج کو سر سے پانو تک گہنا دیتا ہے۔

منگل کے چہرے پر سرخیاں اور سیاہیاں دوڑ گئیں۔ آنکھیں بند ہو گئیں اور جسم کے مشام اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر کہیں چل دیے..... کبھی بارش کے ڈر سے چھپتے، کبھی

اس کے لیے باہر آتے۔ ساون اور بھادوں میں تو بارش ہمیشہ ہوتی ہے جہاں تہاں بھی ہوتی ہے لیکن بڑوں کا کہنا ہے جب بھادوں اور سورج کے بیچ دن اور رات ملتے ہیں، برابر ہوتے ہیں تو دیوی کے کوٹے پر ضرور چھینٹے پڑتے ہیں، بے شمار پڑتے ہیں..... منگل نے ایک اندھے کی طرح لپک کر، اندازے ہی سے رانو کو کلا دے میں لے لیا۔ پھر ایک ہی لمحے میں وہ جسم کے پتے ہوئے زعفران زاروں پہ تھے..... اس سے پہلے کہ ان کے سانس تیز ہوتے ہوئے وہاں پہنچ جاتے جہاں سے وہ پھر لوٹ کر نہیں آتے، منگل رانو سے کہہ رہا تھا۔

”آج تم..... کتنی کھوب شورت لگ رہی ہو..... بھابی!“

(۹)

گھر کے دروازے میں کھڑی، آسمان سے مسلسل بارش پڑتے دیکھ کر سلامتی جھلڑ رہی تھی۔ اپنے تاکوں پہ ہلکے ہلکے تھپڑے لگا رہی تھی۔ پھر وہی ہاتھ اس نے کولھوں سے نیچے تھپکنے شروع کر دیے اور سی سی کرنے لگی جیسے غلطی سے اس نے ایک ساتھ بہت سی مرچیں کھالی ہوں..... گھنٹے اور اذان کی آخری گونج اس کے کانوں سے معدوم ہو رہی تھی اور وہ ملاؤں اور پنڈتوں کو کوسنے دے رہی تھی۔ جنھوں نے انسانی جسم بنایا تو نہ تھا البتہ اس سے انکار، اسے گالی دینے کو ہمیشہ تیار رہتے تھے.....

رات کے دوسرے پہر کا آخر تھا اور بارش تھی کہ ہٹ ہٹ کے پڑ رہی تھی۔ مدر سے کے برآمدے میں، اچھ کے برابر کھڑے مراد نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”بکو اس ہے یار، یہ عورت بھی۔“

خلفی نے اتفاق کیا اور اللہ داد اور حکومت نے بھی۔ اور پھر سب اپنے اپنے لٹھ اور ٹوکے اور چھوٹیاں اور گنڈا سے لے کر، بارش میں بدن کی چربی تک بھیگتے ہوئے اپنے اپنے گھر کی طرف یہ کہتے ہوئے چل دیے ”بچ گیا سکھڑا۔“

مراد کو نامراد لوٹتے دیکھ کر دور، اندر چارپائی پہ پڑی ہوئی سلامتی نے ہاتھ مار کر دیے کہ بچھا دیا۔ پھر اپنے ان پہ اس دن کی آخری انگڑائی توڑی اور بولی۔

”شکر ہے اللہ.....“

(۱۰)

آج سورج نے چھدرے چھدرے بادلوں کے پیچھے اپنا منہ چھپا رکھا تھا۔ آج آسمان کے کوئلے پر کوئی نادان اپنی محنت سے شر مسار، روتا کڑھتا ہوا اپنی پھٹی چادر اوڑھ کے سو گیا تھا۔

ہوائیں چلنے لگی تھیں جن کے دوش پہ لہراتے ہوئے کہیں لوب نار، کوک نار، اور پامیر اور سلیمان کی طرف سے چھوٹے چھوٹے سفید پرندے آنے شروع ہوئے۔ معلوم ہوتا تھا دور، ہزاروں فرسنگ دور، کہیں کھینے والے بچوں نے کانڈ کی کشتیاں، وقت کے دھارے پہ چھوڑ دی ہیں یا دیشنود یوی چھوٹی چھوٹی طشتریوں میں وہ سب نذرانے لوٹا رہی ہے جو صدیوں میں جاتریوں نے ڈھولکیاں اور چھینے بجا بجا کر، امباد یوی کی استی کا گاکر اس کی خدمت میں پیش کیے تھے۔

شب و روز بے اعتدال ہو رہے تھے۔ راتیں دن پہ بھاری ہونے لگیں۔ شکست خوردہ سورج شب کے سامنے شرمایا اور بادل کے پردے سے منہ نکال کر اپنی زمین کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے لگا۔ بس اس کے مسکرانے کی دیر تھی تیر کے پروں پہ رنگ نکھر گیا۔ دراز و سار کی چال میں نئے انداز چلے آئے اور نیم کی نازک سی ڈالی پہ جھولتی، وزن درست کرتی ہوئی جھابیل کے گلے میں سے ایک مترنم اور مطیب بے اختیاری پھوٹ نکلی..... سورج نے نہ صرف جامن اور بکائن اور لنڈے پیل کے پتوں سے صلح کی بلکہ بیول اور کنوار گندل کے بدن پہ اُگے ہوئے کانٹوں کو بھی اپنا کہا۔ اور زمین کے آنسو چوم

چوم لیے.....

کسانوں نے کہیں آنسوؤں کے بیچ، زمین کو زیر لب، دہلی دہلی ہنسی ہنستے دیکھ لیا اور وارفتہ ہو کر اپنے اپنے ہل نکال لیے اور اس مست الست کاشت کو خریف کا نام دیا۔ چھوٹے چھوٹے بچے تک شہوت کی کچی کنواری ڈالیاں توڑ لائے اور ان کی کمانیں بنا، ان پہ چلے چڑھا، ادھر ادھر بے ربط سے تیر پھینکنے لگے۔ مسجد میں ملاؤں نے اور مندر میں پنڈتوں نے تمناؤں کی شومیدھ کے گھوڑے چھوڑ دیے اور پوری کائنات ایک مسلسل، نہ ختم ہونے والی جندہ بازی میں لگ گئی.....

منگل نے اپنا ساز نکالا اور اسپر کلغی سجائی۔ رانی نے تنور پر سے داہڑہ اٹھایا اور اس کے کچھ گیلے ہونے کی وجہ سے اس میں ڈھیر سی چیلیاں اور من چھٹی ڈال دی۔ رات کی آمدنی سے ایک روپيا نکال کر بڑی کو دیا تاکہ جاثوں کے ہاں جا کر خالص گھی لکوا کر لیتی آئے۔ مدرسے میں بڑے بچوں کے شش ماہی امتحان ہو رہے تھے اس لیے چھوٹے چھوٹے جہلم ارا عین کے ہاں مولیاں اور آلو لینے کے لیے پہنچا تو سلامتی کے سرگرد جالی کا دوپٹہ باندھے بیٹھی تھی..... اور کنپیٹوں پہ آٹے کی چڑیاں لگائے.....

چھوٹے کو مولیاں اور آلو خریدتے دیکھ کر سلامتی بول اٹھی..... کیا بات ہے جمیا؟..... آج تمہارے آلو اور مولی کی روٹیاں پک رہی ہیں؟“
”روٹیاں نہیں، پراٹھے۔“ چھوٹے نے اتراتے ہوئے کہا..... ”ماں نے تنور تپایا ہے نا.....“

”ہائے ہائے دے۔“ جہلم کہنے لگی..... ”تیری ماں نے تنور تپایا ہے۔“
”ہاں!“ چھوٹے نے زور سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں پراٹھے لگوانے ہوں تو آ جاؤ یا سلامتی کو بھیج دو۔“

پھر وہ سبزی لے کر چلا گیا اور پیچھے جہلم، عنایتی اور عائشہ ہنستی رہیں۔ سلامتی

طبیعت کے خراب ہونے کی وجہ سے جلی بھنی سنتی رہی۔

پکتے ہوئے پرائٹھوں میں سے خوشبو اٹھ رہی تھی اور اندر بیٹھے ہوئے حضور سنگھ اور جنداں کو لپچا رہی تھی۔ حضور سنگھ سے نہ رہا گیا۔..... ”ذرا نرم لگانا بیٹی“ اس نے کہا ”میرے دانت کام نہیں کرتے۔“ اور جنداں بھی نہ رہ سکی۔ بولی ”دیکھ تو..... ہر وقت کھانے کی پڑی رہتی ہے.....“

رانو نے گھی میں بے پرائٹھے، نئے، صاف سترے جھاڑن میں باندھ کر منگل کی طرف بڑھا دیے۔ منگل نے مخمور سی نگاہوں کے ساتھ رانو کی طرف دیکھا اور پھر اس کے کپچڑ سے پٹے آنگن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔
”بہت صفائی کرنی پڑے گی؟.....“

رانو نے دیکھتے ہوئے کہا..... ”ہاں!“ اور پھر ایک محبوب سی نگاہ منگل پر ڈالتے ہوئے بولی..... ”ہم عورتیں اور بنی کس لیے ہیں؟“
منگل نصیبوں والے اڈے کے لیے نکلنے ہی والا تھا کہ رانو کو کوئی بات یاد آگئی اور وہ فوراً بول اٹھی ”ٹھہرو!“

منگل وہیں رک گیا۔ کچھ دیر میں رانی دوڑی ہوئی اس کے پاس آئی اور بولی ”مجھے دو شلواروں کا کپڑا لا دو..... تیوہار آرہے ہیں.....“

منگل نے ابھی جواب بھی نہ دیا تھا کہ رانو اپنے بدن پہ، سامنے کی طرف اشارہ کرتی ہوئی کہنے لگی ”سب کے پاس یہ ہے میرے پاس ہی نہیں۔“..... اور پھر اوپر دیکھتے ہوئے وہ صرف مسکرائی نہیں کھل کھل کر کے ہنس اٹھی۔

منگل نے تھوڑا سا سر ہلاتے ہوئے کہا..... ”اچھا دیکھو۔“

”دیکھو دیکھو کچھ نہیں۔“ رانو نے بے جھجک کہہ دیا۔ میں کیا سب کے سامنے شلوار

کے پھروں کی اور پھر بولی ”میرا تو کچھ نہیں جاتا.....“

منگل نے ایک دم اپنا سر ہلایا جیسے اپنے حق کو کسی دوسرے سے غلط نہ کرنا چاہتا ہو..... رانو وہ پھر کہنے لگی..... چنوں کو اس کے گھر والے نے صوف کا سوٹ سلوا دیا ہے..... کیسا اچھا لگتا ہے اس کے گورے پنڈے پر کالا کاما، نرم نرم صوف۔
منگل سوچنے لگا۔

رانو نے نے اور آگے ہو کر منگل کے اُریب کرتے کا دامن تھام لیا اور بولی..... تم آج پھر پرسرور نہیں تو گو نجرانوالے نہیں سیالکوٹ سمڑیاں کی سواریاں ڈھونڈ لینا بچے بھی قیصیں مانگتے ہیں.....“

منگل جیسے ایک دم فرمایشوں کے شیریں وترش انبار کے نیچے دب گیا۔ ساز میں سے کلنی نیچے گر گئی جسے اٹھاتے پھر سے نکالتے ہوئے اس نے رانی کی طرف دیکھا جو ابھی تک اس کا کرتا تھاے ہوئے تھی جیسے منگل اس کا چور تھا جیسے رانو کا کوئی قرض تھا جسے منگل کو چکانا تھا۔

”اچھا بابا اچھا“..... منگل نے اپنا کرتا چھڑایا اور چل دیا۔ رانی السائی سی کھڑی، چوکھٹ میں جڑی، ہمیشہ کی طرح اُسے جاتے دیکھتی رہی۔ اس کا مرد..... تکمیل اور تعمیل کی ایک رات اور آدھے ہی دن نے جس کی عمر میں دنوں، مہینوں اور برسوں کا اضافہ کر دیا تھا! پھر رانی اسے کچھ دیکھ کر ایک ایسی ٹھٹک گئی.....

تکو کا!..... نہیں منگل..... منگل..... لیکن، یہ وہ منگل تو نہ تھا جسے ایک دن رانو نے دیکھا تھا، جس دن چنوں نے اس پہ چادر ڈالنے کی بات کی تھی اور ایک البیلے پن میں وارث گاتے ہوئے جسے گلی کے نلکو نے لپک لیا تھا..... آج وہ چپ تھا اور اس کے چوڑے چکلے کا ندھے محبت کے بوجھ سے دب گئے تھے جس کا رن وہ آپ ہی اپنا بڑا بھائی معلوم ہونے لگا تھا.....

وہ جارہا تھا اور گلی کے نلکو جیسے پرے ہو گئے تھے۔ گانو سے باہر کے کالے کوس ایک

دوسرے میں الجھ گئے تھے۔ الجھتے سلجھتے راستے کہیں بھی جاتے تھے لیکن ایک بات طے تھی کہ ان پہ اڑتی ہوئی دھول اور گرد کچھڑ اور غلاظت میں ہر منگل کا خون اور پسینہ رچا ہوا تھا۔ پھر راستوں کے اس گورکھ دھندے میں ایک راستہ ضرور ایسا تھا جو ہر جانور، ہر انسان کو سر شام ”گھر“ لے آتا تھا۔

اپنی نگاہوں کے دھندلکے میں منگل کے حل ہوتے ہی رانی اندر لوٹ گئی۔ آج اس کے پانویقین سے زمین پہ پڑ رہے تھے۔ آج ہر چیز کتنی آسان، کتنی سبک ہو گئی تھی جس کے مقابلے پہ اپنے کچھڑ سے پٹے آنگن کو صاف اور ستھرا اور پھر سے مہمان نواز بنانا کوئی محنت کی بات ہی نہ تھی۔

ایک چادر میلی سی

(۱۱)

کسی کو اندازہ نہ تھا اب کے کوٹلے پہ اتنا جاتری پڑے گا۔ کسی کو گمان بھی نہ تھا اب کے سامنے پہاڑوں پہ وقت سے پہلے برف پڑ جائے گی اور امبادیوی سب بھگتوں کو کوٹلے کی طرف بھیج دے گی۔ اور پسردور، گوجرانوالہ، سمبڑیال، سیالکوٹ، سترہ اور ستو کی سے سواریاں آئیں گی لاریوں اور بسوں پر، تانگوں اور اکوں پر، تیل گاڑیوں اور چھتاریوں پر..... کسی کو معلوم نہ تھا کوٹلے گانوں کے لوگوں کے گھر دولت سے بھر جائیں گے اور ان پر ہن برسنے لگے گا۔ دیوانے شاہ کا سودا بک جائے گا اور جاٹ کا گھی، خیرے کا تیل اور جہلم کی بڑی..... کبوتر مندر کے کلس سے گانوں کی گلیوں میں اتر آئیں گے اور دانہ کھائیں گے اور ان کے پیار کی گھوں گھوں، چوبیس گھنٹے چلنے والی آٹے کی مشین کی کو کو میں گم ہو جائے گی..... اور برات گھر، دھرم شالہ اور ذیلداروں کی حویلی میں تل رکھنے کی جگہ نہ ہوگی اور لوگ دس دس، بیس بیس روپے ایک ایک کو ٹھری کے دیں گے..... سنار کی بالیاں، ٹھٹھیار کی تھالیاں، چراغ کے چوزے، کھار کے کوزے، سب بک جائیں گے اور بڑا پتہ رہے گا نہ محراب پر شہد کا چھتہ..... اور ابھی لوگ آرہے تھے..... تاچتے اور گاتے، دف کوٹے، نفیری بجاتے..... ”بجانا ہے تو بجائو، امبا جی! پاپیوں کے بجانے کی یہی بیلا ہے.....؟“

کوئی نہ جانتا تھا سال کے اس حصے میں کوٹلے کی عورتیں کیوں اوپر سے سو کھشم اوپر نیچے سے استھول ہو جاتی ہیں؟ کوئی کہتا اس کی وجہ پچھلی گرمی ہے، کرئی آنے والی سردی

..... اور پھر وہ ہنسنے لگتے۔ گانو کی گج گانیاں ہاتھوں میں تھالی، تھالی میں صد برگ، صد برگ میں سیندور لیے مندر کی طرف چل نکلتیں اور اپنی ہی چال میں مست کہیں ایک کو لھے پر تھم جاتیں تو گیان چند اور کیسر سنگھ رلدو اور دیوانے کی نبضیں چھوٹ جاتیں۔ ان کے جاتے ہی وہ ہوش میں آ جاتے اور یک زبان ہو کر چلا اٹھتے..... ”ہوئے ہوئے!“.....

آج ہی بڑی پر کرما کا دن تھا۔ حضور سنگھ اور جنداں تک باہر گئے تھے لیکن رانو گھر ہی میں بیٹھی تھی۔ اس کے کارن بڑی بھی نہ گئی تھی..... جو ان جہان لڑکی اور اس پہ پر کرما کے لیے آئے ہوئے ہزاروں البیلے، اس کی ایک انگلی بھی کسی کے حصے میں نہ آتی..... حلا پہ کوئی لال لال چیز ہیں کر رانو اسے انگلی سے سیٹھتی ہوئی ایک کٹوری میں رکھ رہی تھی۔ گھلے ہوئے بین میں ہری مرچ کی دم نظر آتی تھی اور آلو کے قتلے اور چولھے پہ کڑا ہی چڑھی تھی جس میں سرسوں کا تیل اُبل رہا تھا.....

جب ہی چنوں کالے صوف کا سوٹ پہنے، گلے میں گلابی دوپٹہ اڑاتی ہوئی اندر آئی کالی قمیص میں سے اس کا گورا گورا سینہ، محبت اور کینہ لیے زندگی کا سیاہ و سفید سمجھا رہا تھا۔ رانو کو چوہے کے اور صحن میں یوں تھم گڑی دیکھ کر چنوں بولی۔

”ہائے ہائے فی خصم کھا ہے..... آج کے دن تو گھر مری ہے؟“

رانی نے یونہی ساسر ہلا دیا۔

چنوں اور پاس آتے ہوئے بولی ”باہر سب چھڑیں! کٹری تیری جان کو رو رہی ہیں

اور تو یہاں کیا کر رہی ہے؟“

لور چنوں کی نگاہوں کی گلبے کی شلواری پر جا پڑی ”یہ بات!“ چنوں نے اسے

چھوئے، سر ہلاتے ہوئے کہا۔ رانو نے چنوں سے جان چھڑانے کے لیے کڑا ہی میں پونی

ڈال دی۔ ہاتھ اوپر اٹھے تو چنوں کو رانو کے کرتے کے اندر کچھ اور ہی گول سڈول، کچھ

مخروطی سا نظر آیا۔ اس نے بڑھ کر اوپر ہی سے کرتے میں ہاتھ ڈال دیا اور پھر فوراً ہی باہر نکال کر جھٹکنے لگی..... ”ہائے مر گئی!“ وہ بولی، جیسے جلتے ہوئے کوئلے چھو لیے ہوں ”مالم ہوتا ہے منگل تیرے ساتھ سیدھا ہو گیا!“

رانو کچھ نہ بولی۔ دوسرے ہاتھ سے شلاپہ پسلی ہوئی لال ہری چیز کے چٹخارے لینے لگی۔

”یہ کیا؟“ چنوں نے پوچھا۔

اور پھر اس نے غور سے دیکھا۔ کھٹ مٹھی چٹنی تھی۔ چنوں کی آنکھیں چوڑی ہو گئیں۔ ایک انگلی سے اس نے بھی چٹنی کو منہ میں ڈال لیا اور سی سی کرتی آگے بڑھتی رانو کو شانوں سے جھنجھوڑتی ہوئی بولی..... ”ہائے ہائے نی۔ رنڈیے.....؟“

رانو، اونہوں، آنہاں کرتی ہوئی پیچھا چھڑانے لگی۔

”سچ بتا“ چنوں بولی ”نہیں تو میرا مری کامنہ دیکھے..... بتا، تجھے میری

سوگندھ.....

رانو نے کچھ گھور گھار کے بڑی کی طرف اشارہ کیا جو پکی نشانی تھی۔ پھر چنوں کے کان کے پاس منہ کرتے ہوئے بولی ”ہاہو!“

چنوں ایک دم تھرک اٹھی۔ ایک ہاتھ کوٹھے پر، دوسرا سر پر رکھے، وہ اپنے محور کے گرد گھوم گئی اور پھر ایک ایک باہر کی طرف لپکی..... چلاتی، پکارتی ہوئی..... نی سر دپو..... نی چاچی پورو! دو تو نی..... اڑیے کہاں مر گئیں ساری کی ساری.....؟

جتنی تیزی سے چنوں باہر نکلی اتنی ہی تیزی سے منگل اندر آیا۔ دروازے میں دونوں کی ٹکر ہو گئی۔ چنوں دیوار کے ساتھ جا ٹکرائی۔ منگل کی پکڑی پرے جاگری اور جوڑا کھل گیا۔ اسے یوں دیکھ کر چنوں کچھ ہنستے، کچھ خفا ہوتے ہوئے بولی۔

”اندھا!..... دکھائی نہیں دیتا۔ پورا کوڑما ہی! دھرت ۲ راشٹوں کا ہے۔“
 ”پر چنوں!“ منگل نے پگڑی اٹھا کر بات شروع ہی کی تھی کہ چنوں بھاگ
 گئی۔ منگل نے جوڑا لپیٹتے، پگڑی پر سے گرد جھاڑتے ہوئے آواز دی..... ”رانو!“
 رانو سامنے ہی بیٹھی تھی لیکن چونک پڑی۔ آج منگل نے پہلی بار اسے اس کے نام
 سے پکارا تھا۔ وہ رانی بھی کہہ سکتا تھا لیکن رانو..... ضرور کوئی بات تھی۔..... رانو
 نے منگل کی طرف دیکھا جو اس کے پاس آکر اکڑوں بیٹھ گیا تھا جیسے کوئی بڑے راز کی بات
 کہنا چاہتا ہو۔

سن رانو، کمال ہو گیا..... حد ہو گئی.....“
 رانو اندر ہی اندر مسکرا رہی تھی، بولی ”پہلے تم کہہ لو، پھر مجھے بھی تم سے کچھ کہنا
 ہے۔“

”کیا کہنا ہے؟“

”پہلے تم کہہ لو“

منگل کہنے ہی والا تھا کہ اس کی نگاہ بڑی پر جا پڑی جو دیوار کے پاس کھڑی تھی اور
 جس کی نگاہ باہر کی طرف تھی اور کان ماں باپ کی طرف۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے منگل
 بڑے پیار سے بولا..... ”جا بیٹیا! تو اندر جا“

بڑی، چھوٹی سی ہو کر اندر چلی گئی۔ منگل بولا..... ”جاتریوں میں ایک لڑکا آیا
 ہے، پچیس چھبیس برس کا..... گھبرو، جوان..... ڈسکے کے مصدے کا بیٹا.....
 زمینیں، مکان، دکانیں، جائیداد.....“

رانی کے چہرے کی چمک ماند پڑ گئی اور وہ کہہ انھی ”تب تو وہ.....؟“
 ”ارے تو سن تو“ منگل بولا..... ”وہ کہتا ہے میں شادی کروں گا تو بڑی

سے، دنیا کی کسی اور لڑکی سے نہیں؟“

”نہیں“ رانو نے ایک دم سب کام چھوڑ دیا..... اسے یقین نہیں آرہا تھا۔
 ”تیری قسم“ منگل نے کہا..... اور اس نے آج پہلی بار رانو کی قسم کھائی تھی۔
 رانی کی سانس تیز ہونے لگی۔ گلبرے میں اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ مشکل سے اپنے
 آپ کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

”اس نے بڑی کو دیکھا ہے؟“

”ضرور دیکھا ہوگا..... شاید نہ بھی دیکھا ہو۔“

”نہ دیکھا..... نہ ملا، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”کیا معلوم؟“ منگل بولا۔ ”کانو کے بیچ بھی یہی چاہتے ہیں..... اور تو تو جانتی

ہے پنچوں میں پر مشیر ہوتا ہے۔“

”ہاں“ رانی مان گئی ”پنچوں میں پر مشیر نہ ہوتا تو میں آج کہاں ہوتی؟“

کچھ شہ پاتے ہوئے منگل جاری ہوا..... ”وہ سب کہتے ہیں، تیری بیٹی راج

کرے گی، رانی بنے گی..... مطلب، تم ایسی رانی نہیں، وہ..... وہ جو اصلی ہوتی

ہے.....“

یہ سب کچھ رانی کے لیے ناقابل برداشت ہو رہا تھا لیکن منگل کہے جا رہا تھا ”وہ کچھ

لینے دینے میں بھی نہیں۔ اُلٹا سختی سے انکار کرتا ہے۔“ اور پھر ایک ایسی کسی خیال کے آنے

سے وہ کہہ اٹھا۔ ”اس کا یہ مطلب نہیں، میں کچھ دوں گا نہیں۔ مجھ سے جو ہوگا، دوں گا اپنی

بیٹی کو..... پیچھے تھوڑی رکھ لوں گا۔“

”اپنی بیٹی“ رانو کے کانوں کو یقین نہ آرہا تھا۔

”میں تو اس کے لیے بک جاؤں گا، رانو“ منگل نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا

”چاہے اس کے لیے مجھے اکھڑ بھی کیوں نہ بیچنے پڑیں.....“

جب ہی منگل کو کچھ یاد آیا..... ”تم کچھ کہہ رہی تھیں.....؟“
 ”کچھ نہیں“ رانو بولی ”سر مادائی کو بلو ادو..... مجھے ابھی سے اس کے ساتھ
 بات پکی کرنی ہے۔“

”سر مادائی؟“ منگل نے دہرایا اور پھر آنکھیں پھیلاتے ہوئے رانی کی طرف دیکھنے
 لگا اور بولا ”سچ؟“

رانی نے خفیف سا سر ہلایا اور مسکراتے، شرماتے ہوئے پرے دیکھنے لگی۔
 اسی دم چنوں، چاچی، پورو، بھابی، ودیا، جاتکی سروپو، چھوٹی رانی، چنڈی
 عورتوں کا ایک غول کا غول اندر چلا آیا، تالیاں بجاتا، شور مچاتا، ناچتا گا تا ہوا
 چوڑے والی بانہہ کڈھ کے

منڈا موہ لیا توتیاں والا
 چوڑے والی بانہہ دکھا کر تعویذوں والا لڑکا موہ لیا!

دمڑی داسک مل کے

منڈا موہ لیا توتیاں والا

دمڑی کی چھال ہونٹوں پہ مل کر تعویذوں والا لڑکا موہ لیا.....!!
 منگل نے انھیں چپ کرانے کے لیے ہاتھ اوپر کیا۔ ”چنوں..... چاچی!“
 پورن دئی نے آگے بڑھ کر زور سے منگل کو ایک دھکا دیا اور بولی..... ”جارے
 جا، بڑا آیا ہے۔“

”نیکر یڑا!“ چنوں نے بھی دھکا دیا۔

”دقان ہو جا“ ودیا بولی ”تیرا یہاں عورتوں میں کیا کام؟“
 بے حیا پورو بولی..... ”تیرا جو کام تھا تو نے کر دیا..... اب جا کا چلا۔“ اور

پھر رانو کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ”لڑکا پیدا کرتا رہی..... ایک اور مصیبت نہ کھڑی کر لیتا۔“

اور بھی عورتیں اندر آنے اور منگل کو دھکے دے دے کر باہر نکالنے لگیں۔ رانو منگل کو بچاتے ہوئے رو بھی رہی تھی اور ہنس بھی رہی تھی..... ”ہائے ہائے نی رنڈیو!..... ہائے نی میرا مرد..... نی بس کرو، ہائے..... مار ہی ڈالو گی.....؟ اور منگل سر کو بازوؤں میں دے کر اپنی عزت بچاتا ہوا، لمحہ بہ لمحہ دروازے کے قریب ہوتا جا رہا تھا اور چلا رہا تھا..... ”چاچی..... چنوں! جاتا ہوں، میں جاتا ہوں..... میری توبہ میرے باپ کی توبہ“..... اور وہ گر تا پڑتا، پگڑی سنبھالتا ہوا باہر نکل گیا۔

اب میدان عورتوں کے ہاتھ تھا۔ وہ رانی کی طرف بائیں اُلا رُلا کے گارہی تھیں..... ناچ رہی تھیں۔

پودینے کی کر دکڑا ہی رے

ہمارا اچھا کرارا پودینہ..... ہو!

مسالوں والا پودینہ..... ہو!

اور وہ پاگل ہو رہی تھیں۔ ان کے گانے اور ناچ کی رفتار تھی کہ کم ہونے کی بجائے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ان کے شور میں کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ اس پر بھی رانو نے پورو کو پرے لے جا کر کہہ ہی دیا۔

”بدھائی ہو چاچی۔“

”بدھائی کس بات کی؟“ پورن دی نے اپنی ڈھیلی ہوتی ہوئی دھوتی کو کتے ہوئے کہا ”بڑی کے لیے بر مل گیا۔!“

بڑی جو دروازے میں کھڑی تھی، مرچ کی طرح لال ہو کر اندر شک گئی اور عورتیں جن کی نظروں کے افق پر ہمیشہ دو لھے رہتے ہیں اور نیچے دھنیں۔ جن کے کان

شہنائی کی آواز سننے کے لیے شہوانی، آنکھیں برائیں دیکھنے کی متمنی ہوتی ہیں، ایک دم بے خود اور پاگل ہوا نہیں۔ ابھی سے انھیں بڑی کی برات دکھائی دینے لگی، باجے کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ انھوں نے تو یہ بھی نہ پوچھا..... لڑکا کون ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ کیا کام کرتا ہے؟ انھیں تو زرتار سہرے لگائے، سر پر کلفی سجائے، ہاتھ میں تلوار لیے، گھوڑی چڑھا ہوا دولہا نظر آ رہا تھا اور ساتھ جانوروں، بندروں اور سوروں کی برات، جو پھٹے پرانوں میں سے ان کا جو بن لوٹے جارہی تھی۔ اب وہ گارہی تھیں۔

داڑ تھلتے دو نمبو پکے

بیٹھ مٹے ادھارے

..... باڑ کے نیچے دو نمبو پکے میں، جیٹھ ادھار مانگ رہا ہے!

نہ میں جیٹھا ملے دیندی

نہ دیندی رکھوا رہے

ڈنڈیاں نوں دل پے گیا..... جھمکے لین ہمارے

اے جیٹھ! نہ میں مول دیتی ہوں منہ رکھنے کے لیے.....

تازک ڈالیوں کو بل پڑ گیا ہے اور جھمکے جھولنے لگے ہیں۔

ایک اور نے شروع کیا.....

سوہریا بدام رنگیا!

نونہاں گوریاں، پتر تیرے کالے.....

اے بدام کے رنگ والے سر! تیری بہو نہیں گوری ہیں (لیکن) بیٹے کالے

..... وہ اپنے تصور میں دنیا بھر کی دلکھنوں کو ان کی سسرال پہنچا چکی تھیں۔

اس شور کی وجہ سے، دیوی ماں کے درشنوں کے لیے آئی ہوئی پوری پرکرا، منگل

کے گھر کی طرف پلٹ پڑی، جیسے دیوی ماں مندر میں نہیں وہاں ہے یا جیسے مندر وہاں چلا آیا

ہے جہاں خلقت ہے۔ گیان چند سر بنج، تارا سنگھ، نمبردار کیسر سنگھ، جگو، رلدو، دیوانا، کر مو، ذلا، جمالا سب آکر کھڑے ہو گئے..... کوٹھے پر عورتوں کے ٹھٹ نظر آنے لگے، نیچے مردوں کے..... اڑوس پڑوس اور باہر گانوں کے لوگوں کے علاوہ سر مادائی بھی آئی تھی جو ساری دنیا کو دنیا میں لائی تھی اور اب اوروں کو بھی لانا چاہتی تھی۔

جہلم کی تینوں بیٹیاں..... عنایتی، عائشہ اور سلامتی بھی چلی آئیں۔ ساتھ جہلم کے بڑے بھائی کا لڑکا بھی تھا..... مولو! جس کے بے خود، بے بس اشاروں کی طرف دیکھ کر سلامتی شرمارہی تھی، برمارہی تھی۔ پھر نواب کی بیوی عائشہ گورداس کی گن وتی..... سب اگلی پچھلی کدورتیں بھول کر اس لمحے میں کھوکھو گئیں.....

پورو اور ودیا نے رانی کو بھی بیچ میں گھسیٹ لیا..... ان سب کے درمیان ڈبو پاگل ہوا گھوم رہا تھا۔ اسے اُسے سب کو سونگھ رہا تھا، بے تحاشا دم ہلا رہا تھا..... رانو کچھ احتیاط اور کچھ بے احتیاطی سے ناچ رہی تھی۔ اس کے گلبرے کی شلوار..... معلوم ہوتا تھا کوڑیا لے رنگ کا کوئی سانپ ہے جو لپٹا مل کھاتا ہوا اوپر ہی اوپر جا رہا ہے..... رانو جس کا مصیبت میں دبا ہوا حسن آج تک کسی نے نہ دیکھا تھا، پھانٹوں والے کرتے کے بیچ سے آنکھیں مارے چندھیانے، خیرہ کرنے لگا، جیسے کوئی شیطان بچہ ہاتھ میں آئینہ لیے آتے جاتوں پر سورج کی روشنی کا عکس لپکائے، ان کی آنکھیں چندھیائے، بار بار اندھا کیے جائے۔

ناچتی ہوئی عورتوں کی نگاہوں میں دنیا ایک وسیع و عریض دائرہ بن گئی۔ جس کے بیچ مرد، عورتیں، بچے بوڑھے صرف خاکے تھے۔ پھر وہ بھی رنگ کے بڑے بڑے چھینٹوں اور دھنوں میں بدل گئے..... اور آخر ایک ہی رنگ رہ گیا..... سورج کی کرنوں کا رنگ جس میں سب ہی رنگ چھپے رہتے ہیں اور الگ الگ پہچانے جانے کے لیے انسان کی دماغی منشور کے محتاج و منتظر۔

باہر کچھ اور ہی شور مچا اور یہ غول کا غول، جھر مٹ کا جھر مٹ کئی نئے رنگ پیدا کرتا ایک دوسرے پر گر تا پڑتا دروازے پر، کوٹھوں کی منڈیروں پر کنویں کے من پر پہنچ گیا۔

..... یہ جاتری لوگ تھے جو سر جھکائے دیوی کی بھینٹیں گاتے ہوئے آرہے تھے
، ڈھولک، پیٹے چھینے بجاتے ہوئے دیوی ماں کی استی گارہے تھے۔ وہ سب کے سب اپنے
اپنے گناہوں کا کفارہ کرنے چلے آئے تھے..... گناہ، جو ہو چکے تھے..... گناہ جو ہو
رہے ہیں..... گناہ جو ہونے والے ہیں.....
وہ ناج رہے تھے، گارہے تھے۔

ماتارانی دے دربار، جو تاں جگدیاں

میارانی.....

ہے میا! تسیں سنے بھدیاں گوریاں

ماتارانی دے دربار، جو تاں جگدیاں

..... منظر کھلا اور سب نے دیکھا چودھری مہربان داس اور اس کا بھائی گھنٹھام
سات سال کی قید کاٹ کر آرہے تھے، جاتریوں کے شور اور غوغائے ان کو پڑتے ہوئے حال
کے پس منظر میں ان کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں اور نگاہیں زمین پر گڑی ہوئی.....
کمریں سجدوں سے دوہری اور کان تو بہ اور شرم سے لال..... صدیوں کے خضوع اور
خضوع کے بعد اب ان کے ہونٹوں پر چپ چلی آئی تھی اور ان کی یہ چپ داستانیں کہہ رہی
تھی.....

اور ان سب کے بیچ ایک لڑکا تھا..... بچپن میں برس کا..... گھمرو.....

جوان..... خوب صورت..... جو اس وقت بڑے آرام بڑے پیار، بڑی ہی محبت اور
عقیدت سے دیوی ماں کی بھینٹیں گارہا تھا..... اسے دیکھ دیکھ کر لوگ حیران ہو رہے

تھے۔ سب کے ہونٹوں پر ایک ہی سوال تھا۔ نگاہوں میں ایک تجسس..... اتنی چھوٹی عمر میں، اس لڑکے نے کون سا گناہ کیا تھا؟..... شاید..... اس نے گناہ نہیں، گناہ نے اسے کیا تھا.....

جب ہی بھیڑ کو چیرتا، دھکے دیتا، دھکے کھاتا ہوا منگل رانی کے پاس چلا آیا اور اسے کندھے سے پکڑ کر، جھنجھوڑتا ہوا بولا..... ”رانو! وہ ہے..... وہ ہے لڑکا۔“ اور اس نے بھینٹیں گاتے ہوئے لڑکے کی طرف انگلی اٹھائی۔

رانو نے دور سے اس خوب صورت لڑکے کی طرف دیکھا اور اس کی نگاہوں میں سو بھر رچ گئے۔ من ہی من میں اس نے بڑی کی بانہوں کے ہار اس کے گلے میں پہنا دیے اور خود امرتیل بنی اس سے لپٹ لپٹ گئی..... اتنا جوان، اتنا جیلا، گھرو نہ ملا ہو گا کسی ماں کی بیٹی کو، محبت کے جوش میں دیوانی ہوتی ہوئی رانی نے پاس کھڑی چنوں کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور زور سے اسے کھینچتے، اس کی چھیں بلاتے ہوئے بولی

”ہائے نی چنوں..... میں تو پار ہو گئی.....“

بڑی بھی عورتوں کے جھرمٹ میں سے سر نکال نکال کر لڑکے کو دیکھ رہی تھی آپا دھاپی کی اس بھیڑ نے سب کی شرموں کو چھپا لیا تھا، لہو پورے بدن سے کھینچ کر اس کے منہ کو آنے لگا تھا۔ وہی لہو سلامتی کے چہرے سے غائب ہو گیا اور وہ اپنی بڑی بہن سے کہنے لگی

..... ”آپاں، گھر چل..... میں تو تھک گئی.....“

اور رانی بچوں کی طرح اسے اسے سب کو اپنا کھلونا دکھا رہی تھی..... ”دیکھا چاچی؟ وہ تو تو بھی دیکھ..... دیکھ چنڈیے، رنڈیے..... لاجو.....“

پورو چاچی نے دیکھا، دڈیا نے جانچا، چنڈی نے تو لا لاجو، جاکلی، ککی..... اور رانی سب کی طرف دیکھتی، سر جھٹکتی ہوئی بولی..... ”ہے نا؟“

جب ہی رانی کی نظروں کی کڑی ٹوٹ گئی۔ اس نے دیکھا چنوں کے چہرے کا رنگ

ایک دم زرد پڑ گیا تھا۔ اسی بے بہارے، تورے کے پھول کی طرح..... رانی نے ایک تیزی نظر اس پہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”ہائے نی؟“ اور پھر اسی نظر سے لڑکے کی طرف دیکھنے لگی جواب تک قریب آچکا تھا اور نظروں کی جھولیاں پھیلائے ہاتھ جوڑے رانی سے کوئی بھیک مانگ رہا تھا۔ رانی نے ایک دم سانس اوپر کھینچی..... ”میں مر گئی!“

سانس باہر آنے سے پہلے، رانی کے چہرے کی سرخی صاف اور سامنے پر لگا کر اڑتی ہوئی نظر آئی اور وہ روئی کی طرح سفید ہو گئی، پہلے ہاتھ کانپے اور پھر پورے کا پورا بدن تشفی ہو گیا اور وہ لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ”وہی..... یہ تو وہی ہے جس نے میرے.....“

رانی اس ناگہانی صدمے سے بیہوش ہو کر گرنے ہی والی تھی کہ صدیوں کے سترگ سے سفید اور سرافگند، حضور سنگھ کہیں سے گر تا پڑتا چلا آیا اور قریب کھڑی جنداں بوڑی سے بے پروا ہو کر اس نے رانی کو گرنے سے تھام لیا۔ آج اس کی آنکھیں جو ہڑپہ نہانے والے کبوتروں کی طرح پھڑپھڑانے کی بجائے پورے پر تول رہی تھیں۔ شاہین صفت بلند آشیانوں کی طرف اڑ رہی تھیں.....

”بہو۔“ اس نے لرزاتے کانپتے ہوئے ہونٹوں کے بیچ سے کہا ”تو کسے روتی ہے؟..... میری طرف دیکھ، جس نے بیٹا دیا ہے ہمیشہ بیٹا دیا ہے، جب کہیں جا کے ایک بیٹا پایا ہے۔“

اور پھر، بہو رانی کی روح کو پالینے کے جتن میں بڑھا حضور سنگھ خود کہیں کھو گیا۔ اس کی آنکھوں کی گنگا جمناء، اس کی داڑھی کے جنگل بیلوں میں گم ہو رہی تھیں۔ تلوکے کی موت کے بعد آج تک اس کے ہاتھ، کسی نہ ہاتھ آنے والی چیز کی تلاش میں کھپ گئے تھے..... آواز گلے میں کانپتی رہ گئی تھی.....

نہیوں لہٹنے لال گواچے

مٹی نہ پھر ڈل جو گیا.....

جوگی! بے کار کی خاک مت چھان۔ لال جو ایک بار کھو گئے سو کھو گئے۔ اب وہ تجھے نہیں ملیں گے، ہاں، لال کے بدلے تجھے لال مل جائیں گے، ہیرے مل جائیں گے..... مرنی..... پتنے..... پر وہ لال؟..... نہیں.....

جب ہی تو..... حضور سنگھ کی آنکھیں اس دنیا کے رشتوں اور بندھنوں میں کہیں رُل گئی تھیں اور نظارے اٹل کی بے بسی پر رو رہے تھے۔ اب وہ خود نظارہ تھا اور خود ہی ناظر، آپ تماشا اور آپ ہی تماشا..... اس کے سر پہ گیر دے رنگ کی پگڑی بندھی تھی جس کے چچ کھل کھل جاتے تھے۔ اس وقت پلو سے وہ اپنی بھگی ہوئی آنکھیں اور رکیک سی ناک پونچھتا ہوا کوئی جوگی، کوئی رمتارام معلوم ہو رہا تھا۔ وہ دنیا کو چھوڑ رہا تھا۔ پر دنیا سے نہیں چھوڑ رہی تھی..... آج موت کے دروازے پہ کھڑے اسے کوئی دبھ درشتی مل گئی تھی اور وہ دیکھنے لگا تھا..... جنم..... مرن..... اور بیچ میں ایک رانی بہو..... جو شادی کے روز، ایک ایسی کہیں کتم عدم سے معرض وجود میں چلی آتی ہے اور پھنکاری کے پیچھے سے اپنی کلیروں سے آئی، لال لال چوڑیوں سے پٹی، گوری گوری بانہیں نکالتی، چھنکاتی ہے..... منہدی کی خوشبو سے بو جھل ہاتھ جوڑتی، گھونگھٹ کی اوٹ سے، نیم نگاہی کی زبان میں منتیں کرتی اپنے سر سے کہتی ہے پتامہ! تو اپنا ایک یہ بیٹا دے دے مجھے۔ میں اس کے بدلے تجھے دس دوں گی۔ اسی کی شکل میں..... اسی کی عقل میں..... اور پتامہ کہتا ہے..... ہاں ہاں بیٹی! پر یہ بیٹا میرا.....؟ اور پھر وہ آنسو پونچھتا ہوا منہ پھر لیتا ہے.....

رانی کے لائبے لائبے کیش، حضور سنگھ کی انگلیوں کے اندھنے والی شفقت کے سیل میں نہا رہے تھے، چھینٹے اڑا رہے تھے۔ آج اسے اپنے کھوئے ہوئے باپ کی جگہ کوئی

آسمانی باپ مل گیا تھا۔ اسی لیے ہر قسم کے رکھ رکھاؤ سے بے نیاز، وہ بار بار اپنا سر اس کی چھاتی پر بٹخ رہی تھی اور کہہ رہی تھی..... ”نہیں..... نہیں باپو، یہ نہ ہوگا..... ہائے! میری بیٹی!..... میں مر جاؤں گی، باپو.....“

اس وقت پر کرما کے لیے آئی ہوئی ساری خلقت کھم چکی تھی اور ر کے ہوئے سانسوں سے ایک عظیم فیصلے کا انتظار کر رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا رانی ہاں کہے گی تو دنیا میں بس جائیں گی اور نہ کہے گی تو پر لے آجائے گی۔

مہا پر لے، جس میں کیا انسان اور کیا حیوان، کیا پشو اور کیا پنچھی، کیا دھرتی اور کیا آکاش، سب ناش ہو جائیں گے، سسے کے پاس کوئی نوح نہ رہے گا اور خدا کے پاس کوئی روح..... شہد میں جھنکار نہ رہے گی، جیوتی میں پرکاش نہ رہے گا..... اور بچ پر میثور سامنے کھڑے ہاتھ اٹھا اٹھا کر کوئی دعائیں مانگ رہے تھے اور ان کی دعاؤں میں یہ سیدھا سا دوا، معصوم منگل بھی شامل ہو گیا تھا.....

جب ہی رانی کو دلاسا دیتے ہوئے حضور سنگھ بولا..... ”بیٹا! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟..... کیوں ہو رہا ہے؟..... اسے تو نہیں جانتی، نہ میں جانتا ہوں، نہ یہ لوگ جانتے ہیں..... تو اسے سمجھنے کی کوشش بھی مت کر..... ایک چپ، یہاں تو دم مارنے کی جگہ نہیں.....“

رانی نے مڑ کر دیکھا۔ بڑی کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں وہ کہہ رہی تھی..... ماں! یہ تو کیا کر رہی ہے؟ تو نہ بولی تو میں بن بیائی دھرتی کی طرح بانجھ رہ جاؤں گی..... رانی نے سر کے کاندھے پر سے سر اٹھایا اور بولی ”اچھا باپو! اچھا۔“

ایک دم بھینٹیں شروع ہو گئیں۔ لوگ پورے جوش و خروش کے ساتھ گانے بجانے، شور مچانے لگے۔ جن کے بیچ رانی نے اوپر، مندر کی طرف دیکھا، سنہرے کلسوں سے دیوی کا طلائی تبسم منعکس ہو کر رانی کے چہرے پر پڑ رہا تھا اور اسے منور کر رہا تھا.....

تھوڑی ہی دیر میں رات ہو گئی اور اندھیرا چھا گیا۔ اس پہ بھی ایک تیز چکا چوند کر دینے والی روشنی تھی جو جھپک جھپک کر، لپک لپک کر رانی کی طرف آرہی تھی اور جس نے پوری طرح سے اس کے بدن کا احاطہ کر لیا تھا..... اسی دم مندر میں گھنٹیوں کا غوغا مچا، مسجد سے اذان بلند ہوئی اور جہاں کھس تھے، وہاں اندھیرے میں کسی کے ہاتھ پھیلے اور گردن لٹکتی ہوئی نظر آئی۔

ایک ڈر تھا..... اور ایک حظ بھی، جن میں سنسناتی ہوئی رانوں نے اپنے دونوں ہاتھ کھسوں کی طرف اٹھا دیے اور روتی دھوتی، لرزتی کانپتی ہوئی بولی۔

”ماں!..... ہے دیوی ماں!.....!!“

جب ہی ودیا نے پورو کی کمر میں ٹھوکا دیا..... ”ایسے پورو! سب ہی آئے، ایک تیرا دھرم داس نہیں آیا؟“

اور پورو جھوٹ موٹ روتی ہوئی، اپنے شہو کے رانی باپ کا ماتم کرنے لگی۔

ادارے کی دیگر ادبی کتب

- 1- پریم چند کے 15 منتخب افسانے انتخاب: شمیم حنفی 200/- روپے
- 2- چند ہم عصر بابائے اردو: مولوی عبدالحق 200/- روپے
- 3- انتخاب کلام میر بابائے اردو: مولوی عبدالحق 200/- روپے
- 4- دیوان غالب (فرہنگ کے ساتھ) مرزا اسد اللہ خاں غالب 300/- روپے
- 5- دیوان میر تقی میر میر تقی میر 100/- روپے
- 6- مرآة العروس ڈپٹی نذیر احمد 120/- روپے
- 7- باغ و بہار (فرہنگ کے ساتھ) میرامن دہلوی 200/- روپے
- 8- فردوس بریں عبدالحلیم شرر 120/- روپے
- 9- مسدس حالی (جدید ایڈیشن) مولانا الطاف حسین حالی 160/- روپے
- 10- پطرس کے مضامین پطرس بخاری 80/- روپے
- 11- عروض سب کے لیے کمال احمد صدیقی 250/- روپے
- 12- سرمایہ کیفی اعظمی 300/- روپے
- 13- کوکھ جلی راجندر سنگھ بیدی 200/- روپے
- 14- ایک چادر میلی سی راجندر سنگھ بیدی 200/- روپے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com



SEVENth SKY PUBLICATION
Al-Hamd Market, Ghazni Street,
40- Urdu Bazar, Lahore.
Ph: 042-7223584, 0300-4125230